نقش و نگار

نقش و نگار

"نقش و نگار و رنگ و بُو تازہ بہ تازہ، نو بہ نو"

جوشؔ (ملیح آبادی)

پرویز بک ڈپو دہلی

نام کتاب	نقش و نگار
نام مصنف	جوش ملیح آبادی
قیمت	دس روپے
ناشر	پرویز بکڈپو دہلی
طباعت	جمال پریس دہلی

ملنے کا پتہ

ناز پبلشنگ ہاؤس پہاڑی بھوجلہ دہلی ۶

فہرستِ مضامین

مطالعۂ سوز نظر

نسیب

نگارخانہ

شہریست پر ظریفاں وز ہر طرف نگارے

یاراں صلائے عشق است ار میکنند کارے

(حافظ)

یہ کون اٹھا ہے شرماتا

یہ کون اٹھا ہے شرماتا — رین کا جاگا، نیند کا ماتا
نیند کا ماتا، دھوم مچاتا — انگڑائیاں لیتا، بل کھاتا
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

رخ پہ سرخی، آنکھیں جادو — بھینی بھینی بر میں خوشبو
بانکی چتون سمٹے ابرو — نیچی نظریں، بکھرے گیسو
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

نیند کی لہریں گنگا جمنی — جلد کے نیچے ہلکی ہلکی
آنچل ڈھلکا، مسکی ساری — ہلکی مہندی، دھندلی بیندی
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

ڈوبا ہوا رخ، تابانی میں — انوارِ سحر پیشانی میں
یا آبِ گہر طغیانی میں — یا چاند کا مکھڑا پانی میں
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

رخسار پہ موجِ رنگینی — کچی چاندی، سچی چینی
آنکھوں میں نقوشِ خود بینی — مکھڑے پہ سحر کی شیرینی
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

آنکھوں غلطاں عشرت گاہیں نیند کی سانسیں جیسے آہیں
بکھری زلفیں عریاں باہیں جان سے ماریں جس کو چاہیں
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

پھیلا پھیلا آنکھ میں کاجل الجھا الجھا زلف کا بادل
نازک گردن پھول سی ہیکل سرخی پپوٹے نیند سے بوجھل
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

کچھ جاگ رہی، کچھ سوتی ہے ہر موج صبا منہ دھوتی ہے
ناشستہ رخ یا موتی ہے انگڑائی سے جی بیزار ہوتی ہے
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

چہرہ پھیکا نیند کے مارے پھیکے پن میں شہد کے مارے
جو بھی دیکھے جان کو وارے دھرتی ماتا بوجھ سہارے
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

ہلچل ہیں دل کی بستی ہے طوفان جنوں میں ہستی ہے
آنکھ میں شب کی مستی ہے اور مستی دل کو ڈستی ہے
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

سنہ ۱۹۲۵ء

جوانی کی آمد آمد

گیا لڑکپن، نئی جوانی، نئی اداؤں سے آ رہی ہے!
جبیں پہ غنچے کھلا کھلا کر، نظر میں دھومیں مچا رہی ہے
شعاعِ اول پڑی ہے گویا چمن میں نرگس کی پنکھڑی پر
رسیلی آنکھوں میں ہے تبسم لبوں پہ سرخی سی آ رہی ہے
ادائیں پہلو بدل رہی ہیں، نگاہیں کروٹ سی لے رہی ہیں
سنک رہی ہے ہوائے شوخی، حیا کی لو تھرتھرا رہی ہے
مژہ میں بیدار کر رہا ہے فسوں کو، تیر افگنی کا ارماں
دلوں میں شبخون کی تمنا، نظر میں جادو جگا رہی ہے
قمر کے خواب آفریں جہاں میں دمکنے والا ہے مہر تاباں
چھٹا رہا ہے نظر دُھندلکا، سحر نگاہیں اٹھا رہی ہے
ہر ایک تارِ نظر برابر مچل رہا ہے پئے نظارہ
ہر ایک موجِ نفس پیاپے درِ طرب کھٹکھٹا رہی ہے
دراز و شب رنگ کاکلوں میں تڑپ رہی ہیں نئی امنگیں
صبیح و شاداب عارضوں میں حیاتِ نو مسکرا رہی ہے

ہوا طبیعت کی رخ بدل کر بھٹک رہی ہے نئی فضا میں
کلی لڑکپن کی مسکرا کر نئے شگوفے کھلا رہی ہے
جھلکتی چاندی پہ کمسنی کی، چڑھا رہا ہے شباب سونا
سفید ہلکی سی چاندنی کو سحر گلابی بنا رہی ہے
گلاب سے عارضوں کی تہ میں شباب تھم تھم کے پر فشاں ہے
نظر فریب آنکھڑیوں کی رو میں شراب [illegible] کے رس آ رہی ہے
سکون کی نیم وا گرہ پر چمک رہا ہے خلش کا ناخن
حیات کے دم بخود افق پر نئی کرن جگمگا رہی ہے
جھپک جھپک کر نکیلی پلکیں زباں کے سانچے میں ڈھل رہی ہیں
مچل مچل کر رگوں میں شوخی، قدم اٹھانا سکھا رہی ہے
لچک لچک کر ہر ایک قدم پر، بل پڑ رہے ہیں پیہم
سنک سنک کر ہوائے عشوہ گھنیری زلفیں ہلا رہی ہے
کلام یوں کر رہی ہے گویا چٹک رہی ہیں چمن میں کلیاں
نگاہ یوں اٹھ رہی ہے جیسے کوئی پری گنگنا رہی ہے
لبوں پہ وہ سرخیاں، ہیں جیسے ہلا دامن میں ہو شفق کے
نظر میں ہے وہ خمار، گویا ذرا ذرا نیند آ رہی ہے

سنہ ۱۹۳۵ء

اٹھتی جوانی

نئی ہے نام خدا جوانی نئی امنگیں، نیا زمانہ
جبیں پہ سازِ طرب کی موجیں
نگاہ میں سوزِ شاعرانہ

دلوں پہ مارے ہوئے شبخوں لہو سے ہے سرخ چشم میگوں
ہر اک اشارے میں ایک افسوں
ہر ایک چشمک میں اک فسانہ

نفس میں پھولوں کی سی مہک ہے جبیں پہ خورشید کی دمک ہے
کمر میں تلوار کی لچک ہے
نظر میں بجلی کا آشیانہ

جلو میں مستی و ہوشیاری طواف میں کائنات ساری
جمال کی زد پہ ذوقِ یاری
نظر میں شانِ پیمبرانہ

صبیح چہرے پہ نورِ شبنم گداز شانوں پہ زلف برہم
ہر اک موجِ نفس میں پیہم

بلندیوں کی طرف روانہ

ہر اک قدم فتنۂ ونلاطم ۔ نیاز مندی میں بھی تحکّم
پلک جھپکنے میں اک تبسم
نظر اٹھاتے ہیں اک ترانہ

جو چاہیں صہبائے مشک بوئیں ۔ تمام عالم کو غرق کر دیں
یہ سرخ ڈورے یہ مست آنکھیں
کھلا ہے جن میں شراب خانہ

سدھی ہوئی اس غضب کی پلکیں ۔ کہ آنکھ ملتے ہی دل میں ڈوبیں
منجی ہوئی اس بلا کی جھٹکے سے
کبھی نہ خالی گیا نشانہ

سکوت میں لحن دل ربائی ۔ خطاب میں شان کبریائی
جدھر چلی ۔ چل پڑی خدائی
جدھر مڑی ، مڑ گیا زمانہ

وہ رُخ پہ طوفان کیفِ شب کے ۔ کہ لیکے انگڑائی منہ اندھیرے
اٹھے جو آنکھیں ہتیلوں سے
ٹپک پڑے بادۂ شبانہ

درِ صنم پر، خدائے الفت ۔ قبول فرما مری عبادت
نہ دے مجھے مسجدوں کی دعوت
کہ دین میرا ہے شاعرانہ

یہ نظر کس کے لئے ہے

اے نرگسِ جاناں! یہ نظر کس کے لئے ہے؟
یہ شعلہ، یہ بجلی، یہ شرر کس کے لئے ہے
اے زہرہ جبینوں کے لئے پیکِ ہزیمت!
پیغامبرِ فتح و ظفر کس کے لئے ہے
اے تجھ کو ملے عمر مری شام بلا کی
یہ زلفِ رسا، نازِ کمر کس کے لئے ہے
اے سایۂ کاکل میں چمکتے ہوئے عارض!
ظلمات میں یہ آبِ خضر کس کے لئے ہے
اے قامتِ بالا و بلند! اے قدِ موزوں!
یہ سرو، یہ شاخِ گل تر کس کے لئے ہے
اے دیدۂ مے پروردا اے نرگسِ مخمور
چھلکا ہوا یہ ساغرِ زر کس کے لئے ہے

اے عارضِ ناشستہ و روئے عرق آلود!
یہ شہد، یہ شبنم، یہ شکر کس کے لئے ہے
اے تجھ پہ فدا چشمکِ خورشید جہاں تاب
رُخ پر یہ تبسّم کا اثر کس کے لئے ہے
اے زانوئے کونین کی دیرینہ تمنا!
قرباں تری زلفوں کے یہ سر کس کے لئے ہے
اے حُسنِ رخِ روشن و اے جلوۂ کاکل!
یہ ہوش رُبا شام و سحر کس کے لئے ہے
اے تیرے قدم پر سرِ خوباں سرافراز!
یہ ناز، یہ دزدیدہ نظر کس کیلئے ہے
اے گیسوئے آشفتہ و اے کاکلِ برہم!
یہ عمرِ مسیحا و خضر کس کے لئے ہے
اے خود سے الجھی ہوئی بدمست جوانی
ہر سانس میں یوں زیر و زبر کس کیلئے ہے
اے شوخ، کبھی جوش سے اس نظم کی ضد پر
یہ پوچھ کہ تو خاک بسر کس کے لئے ہے

☆

افشائے راز

کس طرح مانوں کہ اس نکھرے ہوئے انداز سے
آ رہی ہیں آپ ابھی خلوت سرائے ناز سے
سعی اخفائے حقیقت میں نہ کیجئے اہتمام
عارضِ گلگوں میں رقصاں ہے نسیم باغِ عامؔ[1]

چھپ نہیں سکتا ہے اربابِ نظر سے کوئی راز
کیا کوئی خلوت سے آتا ہے یہ ایں طغیانِ ناز
حال ابھی کھل جائے گا، بکھرایئے زلفِ دراز
ساتھ ہیں، مڑ مڑ کے کتنے دیکھنے والوں کے راز

رہروؤں کی حسرتوں کا ہے تنظر میں ارتعاش!
جنبشِ مژگاں کی رو میں کتنے دل ہیں پاش پاش
کتنی تانوں کا اثر ہے رس بھری آواز پر
کتنی سرد آہوں کے پرتو ہیں جبینِ ناز پر

لے رہیں ہیں کروٹیں لپٹی ہوئی انوار میں
کتنی للچائی ہوئی نظریں، لب و رخسار میں

---

[1] حیدرآباد کا ایک دلفریب باغ

کتنے سینوں کی تمنائیں رہینِ اضطرار
ان گھنی پلکوں کی رنگین چھانوں میں ہیں بیقرار

اپنے دامن میں لئے ہے کتنی روحوں کی ترنگ
پنکھڑی کی طرح ان ترشے ہوئے ہونٹوں کا رنگ

ہیں جلو میں، آپ خود دامن جھٹک کر دیکھ لیں
ریشمی آنچل کے چھو لینے کی کتنی حسرتیں

دیکھنے والوں کی بیتابی کا ہے رخ پر سرور
چال میں بیدار ہے اٹھتی جوانی کا غرور

اپنے چہرے کی بہارِ کامرانی دیکھئے!
کس قدر بشاش و فرحاں ہے جوانی دیکھئے

کاوشِ اخفا میں الٹی اور رسوائی ہوئی!
کہئے، کیوں اٹھتی نہیں اب آنکھ شرمائی ہوئی

یار پری چہرہ

وہ یار پری چہرہ کہ کل شب کو سدھارا
طوفاں تھا، تلاطم تھا، چھلاوا تھا، شرارا
گل بیز و گہر ریز و گہر بار و گہر تاب
کلیوں نے جسے رنگ دیا، گل نے سنوارا
نوخواستہ و نورس و نوطلعت و نوخیز
وہ نقش جسے خود دیدۂ قدرت نے ابھارا
خوں ریز و کم آمیز و دل آویز و جنوں خیز
ہنستا ہوا مہتاب، دمکتا ہوا تارا
خوش چشم و خوش اطوار و خوش آواز و خوش اندام
اک خال پہ قربان سمرقند و بخارا
گل پیرہن و گل بدن و گلرخ و گلرنگ؟
ایماں شکن، آئینہ جبیں، انجمن آرا،
صبح گل نوخواستہ و شام شگوفہ؛
مرہم نے کا سامان، تو جینے کا سہارا

آئینۂ رخسار پر اک خالِ سیہ تاب
پیشانیِ گل رنگ پر آنچل کا کنارا
آنکھوں کے چمکنے میں تقاضائے تلطف
پلکوں کے جھپکنے میں تمنائے مدارا
وہ لب کہ مہِ نو کی دھڑکنے لگے چھاتی
وہ آنکھ کہ موتی کو نہ ہو صبر کا یارا
کلیوں کی نمائش میں اگر ہو متبسم
ہو اس کے ہونٹوں کی طرف کثرت آرا
نظریں جو اٹھا دے تو لرزنے لگے خورشید
ابرو کو جو بل دے تو ہو مہتاب دوپارا
اللہ ری ملبوس کی تابش شبِ مہ میں
سلما جو دمکتا تھا، جھمکتا تھا ستارا
تھا میری نگاہِ طرب آموز کا پابند!
رنگِ لب و رخسار کا چڑھتا ہوا پارا
صندل کی دمک تھی عرق آلودہ جبیں پر
یا نہرِ گلستاں میں تڑپتا ہوا تارا
نغموں کے تلاطم سے تھا جنبش میں لبِ لعل
لہروں کے تھپیڑوں میں تھا دریا کا کنارا

ہر سانس میں اپنے ہی یہ پیچیدہ جوانی
ہر گام پہ بکھری ہوئی زلفوں کا نظارا
اس طرح تبسم میں تحکم کی گھلاوٹ
جس طرح مے تند کی تلخی ہو گوارا!
کاکل کے خم و پیچ سے افشاں کا جھلکنا
ظلمات سے تھا چشمۂ حیواں کا اشارا
سرشار جوانی تھی کہ امڈے ہوئے بادل
شاداب تبسم تھا کہ جنت کا نظارا
زلفیں تھیں کہ ساون کی مچلتی ہوئی راتیں
شوخی تھی کہ سیلاب کا مڑتا ہوا دھارا
رُخ بات کا اقرار سے انکار کی جانب
جس طرح ہرن دشت میں بھرتا ہو ترارا
اللہ کرے وہ صنم دشمن ایماں!
مچلے کسی شب جوشؔ کے پہلو میں دوبارا
(۱۹۳۳ء)

نیچی نگاہیں

آہ یہ نیچی نگاہیں، اے نگارِ شرمگیں!
عشق، اس کافر حیا کی تاب لا سکتا نہیں!

یہ شہابی رنگ، نازک جلد میں رخسار کی
خون کا یہ رقص، یہ ہیں عارضِ گلنار کی

سُرخ آنچل کا ڈھلک جانا یہ سر سے بار بار!
دونوں ہاتھوں سے چھپا لینا یہ منہ بے اختیار

سرنگوں ہیں پھول، سکتے میں ہے پیمانے کا رنگ
اُف یہ نم آلود رخساروں پہ شرمانے کا رنگ

عارضِ گلرنگ پر یہ پھول سا کھلتا ہوا
یہ تبسم جو طلوعِ صبح سے مہکتا ہوا

گفتگو یہ، سر جھکا کر شرمگیں انداز سے
یہ گرہ ہر لفظ میں رکتی ہوئی آواز سے

ہر نفس، کڑیاں سی کھلنا سانس کی زنجیر میں
کہتے کہتے کچھ یہ رک جانا ترا تقریر میں

لب کو یوں جنبش سی ہو نا نطقِ شرم آمیز سے
پنکھڑی جس طرح مڑ جائے ہوائے تیز سے

(سنہ ۱۹۲۵ء)

جمنا کے کنارے

خورشید طلوع ہو رہا ہے
جلووں کی ہے چھوٹ شاخ روش پر
رہ رہ کے جھلک رہا ہے پیہم
گردوں کی جبیں دمک رہی ہے
جاگے ہیں طیور چہچہاتے
مکھڑوں پہ لئے بصد تجلی
پونچھیں منہ کو اگر ذرا کبھی
رگ رگ میں ہے محو پرفشانی
پھوٹی ہے کرن جو تلملاتی
لائی ہے نسیم لے کے گیسو،

افسانہ شروع ہو رہا ہے
رقصاں ہے شعاع ہر کلس پر
ہر ذرۂ خاکدانِ عالم
پودوں کی کمر لچک رہی ہے
چونکے ہیں حسین کسمساتے
شبنم کی نمی، صبا کی خنکی
رو مال ہیں چھوٹ آئے سرخی
وارستہ مزاج نوجوانی
شبنم کی دھڑک رہی ہے چھاتی
کلیوں میں مچل رہی ہے خوشبو

اس عالمِ رنگ و بو کے اندر
میدان سے اک ذرا سا ہٹ کر

اک قصر، قریبِ رود جمنا | لہروں کو بنا رہا ہے بینا
یوں قصر کا عکس ہے سرِ آب | ارماں جیسے ہوں دل میں بیتاب

اس قصر کے بام پر کھلے سر
اک زہرہ جبیں و ماہ پیکر

نو خیز، حسین، بلند بالا | اوڑھے ہوئے سرمئی دوشالا
افسوں بہ نگاہ و زلف بر دوش | غرفے میں کھڑی ہوئی ہے خاموش
فردوس کے در کئے ہوئے باز | ٹیکے ہوئے کہنیاں بصد ناز
رنگین کلائیوں کو جوڑے | چہرے کو ہتھیلیوں پہ رکھے
گلدان میں پھول ہنس رہا ہے | قرآں ہے کہ رحل پہ دھرا ہے
طوفان ہیں دل ربائیوں کے | ہوتے ہیں حباب کلائیوں کے
آنکھوں میں ہے تابِ صبح روشن | ہونٹوں میں شگفتگی کا مسکن
انجم کی طرح جبیں پہ ٹیکا | خورشید سپہر کمسنی کا
کانوں میں نظر فریب بندے | اے کاش کوئی یہ پھول چن دے
چہرے پہ ہے گرم لن ترانی | اٹھرہ کا سن، نئی جوانی
اک سانس میں بند سے گرانبار | اک سانس میں بیقرار و بیدار
ایک سانس میں پاس آ رہی ہے | ایک سانس میں دور جا رہی ہے
الجھی، بکھری سیاہ زلفیں | چبھتی ہوئی نیند انکھڑیوں میں

دریا کی ہوا جو کہہ رہی ہے
بشاش ہے مسکرا رہی ہے
اوریوں کہ قریبِ لب زرا سا
عارض میں پڑا ہوا ہے حلقہ
اس حلقۂ دل نشیں کے اندر
غلطیدہ ہیں ناز کے سمندر
یہ شانِ جمال، اللہ اللہ،
انسان کے بھیس میں عبَابہ
یہ حسن، یہ دل کشی، یہ عالم
سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے شبنم
جس خاک سے گزرے کیمیا ہو
جس بت پہ نظر کرے، خدا ہو
شاعر کا بھی اک حقیر سجدہ
اے دشمنِ دین! قبول فرما
"حسن تو ہمیشہ در فزوں باد
رویت ہمہ سال لالہ گوں باد
قد ہمہ دلبران عالم
در خدمتِ قامت نگوں باد"

(حافظ)

۱۹۲۸ء

گنگا کے گھاٹ پر

بڑھائے سرخیٔ عارض ہوائے صحرا سے
نہایا کون چلا آ رہا ہے گنگا سے

سرادھ لاٹی کا سر پر، نظر جھکائے ہوئے
دبائے دانتوں میں آنچل، بدن چرائے ہوئے

لبوں پہ مہر خموشی، خموشیوں میں خطاب
کمر میں لوچ، جبیں پر دمک، نظر میں شراب

قدم قدم پہ تمنائیں دلستانی کی
رخ شگفتہ پہ طغیانیاں جوانی کی

شراب ناب لیے نرگسی کٹورے نہیں
لہو چمن کا رواں سرخ سرخ ڈوروں میں

دراز زلف میں جادو، سیاہ آنکھ میں بدھ
نسیم صبح بنارس، ہلاس شام اودھ

ہوائے صبح سے روشن چراغ سیم تنی
شگفتہ غسل سحر سے مزاج گل بدنی

نظر نہ آئے وہ چہرے پہ چادر آبی
بیاض چشم میں گل کاری شکر خوابی

خنک نسیم سے ابھرے ہوئے نقوش شباب
صباحتیں ہیں کہ برسات کی شب مہتاب

عجیب حسن ٹپکتا ہے چشم و ابرو سے
مہک رہی ہے ہوا کسی کی خوشبو سے

مقابلہ جو کرے کوئی جھاڑ پھیکا ہے
جبین شوخ پہ صندل کا سرخ ٹیکا ہے

نمی ہے زلف میں، اشنان کر کے نکلی ہے
یہ کس کی موت کا سامان کر کے نکلی ہے

لبوں پہ کھیل رہا ہے اثر نہانے کا
گمان ہوتا ہے ہر بار مسکرانے کا

سیاہ زلف پر آنچل خفیف آبی ہے
برہنہ پا ہے تو ہر نقش پا گلابی ہے

مری طرف سے کوئی کاش یوں ہو گرم خطاب
کہ وقت صبح ہے اے دختر شب مہتاب

ازل کے دن سے درِ حسن کا بھکاری ہوں
ادھر بھی ایک نظر میں ترا پجاری ہوں

(۱۹۲۲ء)

★

مالن

آرہی ہے باغ سے مالن وہ اٹھلاتی ہوئی
مسکراتے ہیں لبوں سے پھول برساتی ہوئی
بار بار آنکھیں اٹھاتی، سانس لیتی تیز تیز
رس جوانی کا گھنی پلکوں سے ٹپکاتی ہوئی
پاؤں رکھتی ناز سے، شبنم کے قطروں کی طرح
سبزۂ خوابیدۂ گلشن کو چونکاتی ہوئی
آستینوں میں سے جھلکاتی ہوئی باہوں کا رنگ
کاکلوں میں سے "کرن پھولوں" کو جھمکاتی ہوئی

نغمۂ گیسو سے ہر جھونکے میں بھرتی بوئے گل
نقشِ پا سے ہر روش خون دوڑاتی ہوئے
نصف آنکھیں بند کر کے سونگھتی پھولوں کے ہار
ہر نفس بیہوش ہو کر ہوش میں آتی ہوئی
چھیڑ خود اپنے ہی سے کرتی ہوئی مستانہ وار
ہر قدم پر کاکلوں کی طرح بل کھاتی ہوئی
اینڈتی، مڑتی، خود اپنی کمسنی سے کھیلتی
بھاگتی، رکتی، کھٹکتی، بال بکھراتی ہوئی
گنگناتی، مسکراتی، لڑکھڑاتی، جھومتی
مثلِ ابر اپنے ہی پر خود پیچ و خم کھاتی ہوئی
پھول ہیں آنچل میں، آنچل ٹوٹتا ہے دوش پر
اور آنچل پر گھنی زلفیں ہیں لہراتی ہوئی
ہائے کیا گوری کلائی میں ہے چھلا دلفریب
ہائے کیا چاندی کی ہیکل ہے ستم ڈھاتی ہوئی
جوشؔ پوچھے کوئی اس گل پیرہن مالن کا نام
آ رہی ہے غنچۂ دل کو جو چٹکاتی ہوئے

(۱۹۲۳ء)

جامن والیاں

روحِ شاعر آج پھر ہے وجد میں آئی ہوئی
آم کے باغوں پہ ہے کالی گھٹا چھائی ہوئی
مست کھیو نر اگو بجتا پھرتا ہے کوہ و دشت میں
روح پھرتی ہے کسی وحشی کی گھبرائی ہوئی
غنچہ غنچہ اپنے فطری رنگ میں ڈوبا ہوا
پتی پتی اپنے اصلی رنگ پر آئی ہوئے
خارِ صحرا فیض ابر و باد سے نکھرے ہوئے
خاکِ گلشن. موج رنگ و بو سے اترائی ہوئی
بہ رہی ہیں ندیاں. ساون کے نغموں کی طرح
گا رہی ہیں کوئلیں، موسم کی نرمائی ہوئے
آ رہی ہیں ناز سے نوخیز جامن والیاں
انکھڑیوں میں اجنبیت، چال اٹھلائی ہوئی
عمر کے نشے سے کچھ کچھ نیند میں ڈوبی ہوئی
برق کی ہلچل سے کچھ کچھ ہوش میں آئی ہوئی

ابر میں لچکے ہوئے پودوں کا دستِ پا میں لوچ
دھوپ کے تپتے ہوئے کھیتوں کی سنولائی ہوئی
کھر رہی ہیں تر بتر گلیوں میں سوتی جاگتی
منہ اندھیرے ہی سے بوچھار دنگی چونکائی ہوئی
دونوں ہاتھوں سے سنبھالے ہیں سر پہ ٹوکری
ہاتھ انگڑائی کی صورت، آنکھ شرمائی ہوئی
ہائے یہ بکھری ہوئی زلفیں، یہ کالی چاندنیں
ہائے یہ گلشن، یہ ساون کی گھٹا چھائی ہوئی
پائے نازک، راہ کے پانی سے یہ بھیگے ہوئے
پنڈلیاں، زورِ جوانی سے یہ بل کھائی ہوئی
ہائے یہ بھینچی ہوئی نوعمر جامن والیاں
عاقبت اندیش دہقانوں کی سمجھائی ہوئی
یہ جھجک اٹھنا جوانوں کی نظر سے بار بار
یہ نگاہیں، شہر کی گلیوں میں گھبرائی ہوئی
ہائے یہ کافر مناظر ہوش میں رکھتے نہیں
جوش ان فصلوں میں اکثر اپنی رسوائی ہوئی

(۱۹۲۵ء)

جنگل کی شاہزادی

پیوستہ ہے، جو دل میں، وہ تیر کھینچتا ہوں
اک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں

گاڑی میں گنگناتا مسرور جا رہا تھا
اجمیر کی طرف سے جے پور جا رہا تھا

تیزی سے جنگلوں میں یوں ریل جا رہی تھی
لیلیٰ ستار اپنا گویا بجا رہی تھی

خورشید چھپ رہا تھا رنگین پہاڑیوں میں
طاؤس پر سمیٹے بیٹھے تھے جھاڑیوں میں

کچھ دور پر تھا پانی، موجیں رکی ہوئی تھیں!
تالاب کے کنارے شاخیں جھکی ہوئی تھیں

لہروں میں کوئی جیسے دل کو ڈبو رہا تھا!
میں سو رہا ہوں، ایسا محسوس ہو رہا تھا

اک موجِ کیف پرور دل سے گزر رہی تھی
ہر چیز دلبری سے یوں رقص کر رہی تھی

نفیس رخصتی کرن سے سب وادیاں سنہری
ناگاہ چلتے چلتے جنگل میں ریل ٹھہری

کانٹوں پہ خوبصورت اک بانسری پڑی ہے
دیکھا کہ ایک لڑکی میدان میں کھڑی ہے

زاہد فریب، گل رخ، کافر، دراز مژگاں
سیمیں بدن، پری رخ، نوخیز، حشر ساماں

خوش چشم، خوبصورت، خوش وضع، ماہ پیکر
نازک بدن، شکر لب، شیریں ادا، فسوں گر

کافر ادا، شگفتہ، گل پیرہن، سمن بو
سرو چمن، سہی قد، رنگیں جمال، خوش رو

گیسو کمند، مہوش، کافور فام قاتل!
نظارہ سوز، دلکش، سرمست، شمع محفل

ابرو ہلال، مے گوں، جاں بخش، روح پرور
نسریں بدن، پری رخ، سیمیں عذار دلبر

آہو نگاہ، نورس، گلگوں، بہشت سیما
یاقوت لب، صدف گوں، شیریں، بلند بالا

غارتگرِ تحمل، دل سوز، دشمنِ جاں
پروردۂ مناظر، دوشیزۂ بیاباں
گلشن فروغ، ہمکن، مخمور، ماہ پارا
"دلبر کہ در کفِ او موم است سنگِ خارا"
ہر بات ایک افسوں ہر سانس ایک جادو
قدسی فریب مژگاں، یزداں شکار گیسو
صحرا کی تربیت و زینت، فطرت کی تور دیدہ
برسات کی ملائم تاروں کی آفریدہ
چہرے پہ رنگِ تمکیں، آنکھوں میں بیقراری
ایمائے سینہ کوبی، فرمان بادہ خواری!
لوہا تپانے والی جلووں کی ضوفشانی
سکے بٹھانے والی اٹھتی ہوئی جوانی سے
ڈوبے ہوئے سب اعضا حسن مناسبت میں
پالی ہوئی گلوں کے آغوش تربیت میں
حسن ازل ہے غلطاں شاداب پنکھڑی میں
یا جان پڑ گئی ہے جنگل کی تازگی میں

حوریں ہزار دل سے قرباں ہو گئی ہیں
رنگینیاں سمٹ کر "انسان" ہو گئی ہیں

چین ستم گری سے نا آشنا جبیں ہے
میں کون ہوں، یہ اسکو معلوم ہی نہیں ہے

ہر چیز پر نگاہیں حیرت سے ڈالتی ہے
وہ رہ کے اڑنے والی چادر سنبھالتی ہے

آنچل سنبھالتے میں یوں بل سے کھا رہی ہے
گویا ٹھہر ٹھہر کر انگڑائی آ رہی ہے

کچھ دیر تک تو میں نے اس کو بغور دیکھا
غش کھا رہی تھی عقبیٰ، چکرا رہی تھی دنیا

گاڑی سے پھر اتر کر اس کے قریب آیا
طوفانِ بے خودی میں پھر یہ زباں سے نکلا

اے درسِ آدمیت، اے شاعری کی جنت
اے صانعِ ازل کی نازک ترین صنعت

اے روحِ صنفِ نازک اے شمعِ بزمِ عالم
اے صبحِ روئے خنداں، اے شامِ زلفِ برہم

اے نوکہ تیری نازک ہستی ہیں کام آئے
قدرت کی انتہائی تخئیلِ دلربائی سے

چشم و چراغ صحرا، اے نور دشت و وادی
رنگین جمال دیوی، جنگل کی شاہزادی

بستی ہیں تو جو آئے، اک حشر سا بپا ہو
آبادیوں ہیں ہلچل، شہروں ہیں غلغلہ ہو

رندان بادہ کش کے ہاتھوں سے جام چھوٹیں
تسبیح شیخ الجھے، توبہ کے عزم ٹوٹیں

نظروں سے اتقا کے رسم و رواج اتریں
زُہاد کے عمامے، شاہوں کے تاج اتریں

آنکھیں ہوں اشک افشاں نالے شرر فشاں ہوں
کیا کیا نہ شاعروں کے ملبوس دھجیاں ہوں

شہروں کے ہوشوں پر اک آسمان ٹوٹے
پروردۂ تمدن عشووں کی نبض چھوٹے

اس سادگی کے آگے نکلیں دلوں سے آہیں
جھک جائیں دلبروں کی خود ساختہ نگاہیں

تیری ادا کے آگے شرما کے منہ چھپائیں
ناپے ہوئے کرشمے، تولی ہوئی ادائیں

تیری نظر کی رو سے ہو جائیں خستہ و گم
مشق و مزاولت کے پالے ہوئے تبسم

من دا ماں کے رخ کو بے آب و رنگ کر دے
دنیا کو حسن تیرا میدان جنگ کر دے

کتنی ہی قسمتوں کے بدلے فلک نوشتے!
خون اور دوستی کے کٹ جائیں کتنے رشتے

تصنیف ہوں ہزاروں چھینے ہوئے فسانے
ان انکھڑیوں کی زد پر کانپیں شراب خانے

تیرے پجاریوں میں میرا بھی نام ہوتا
اے کاش جنگلوں میں میرا قیام ہوتا

یہ بن، یہ گل، یہ چشمے، مجھ سے قریب ہوتے
شاعر کے زیر فرماں یہ سب رقیب ہوتے

کیوں، میری گفتگو سے حیرت فروش کیوں ہے
اے زمزموں کی دیوی اتنی خموش کیوں ہے

بجنے لگیں وفا کی محفل میں شادیانے
ہاں دے لبوں کو جنبش، اے سرمدی ترانے

یوں چپ ہے مجھ سے گویا کچھ کام ہی نہیں ہے
یہ وہ ادا ہے جس کا کچھ نام ہی نہیں ہے

سنتا تھا یہ کہ ظالم اس طرح مسکرائی
فریاد کی نظر نے، ارماں نے دی دہائی

عشوہ جبیں پہ لیکر دل کی امنگ آیا!
چہرے پہ خون دوڑا، آنکھوں میں رنگ آیا

شرما کے آنکھ اٹھائی، زلفوں پہ ہاتھ پھیرا
اتنے میں رفتہ رفتہ چھانے لگا اندھیرا

چمکا دیا حیا نے ہر نقش دلبری کو
دانتوں میں یوں دبایا چاندی کی آرسی کو

سن کر میری مچلتی آنکھوں کی داستانیں
اس کی نگاہ میں بھی غلطاں ہ دیئں زبانیں

شرما کے پھر دوبارہ زلفوں پہ ہات پھیرا
دیکھا تو چھا چکا میرا ان پہ اندھیرا

کچھ جسم کو چرایا کچھ سانس کو سنبھالا
کاندھے پہ نرم آنچل انگڑائی لیکے ڈالا
تاریک کر کے میری آنکھوں میں اک زمانہ
جنگل سے سر جھکا کر ہونے لگی روانہ

ہونے لگی روانہ، ارماں نے سر جھکایا
دل کی مثال کانپا رہ رہ کے بن کا سایا
بیہوش ہو چلا میں، سینے سے آہ نکلی
اتنے میں رات لے کر قندیل ماہ نکلی

مڑ کر جو میں نے دیکھا، امید مر چکی تھی
پٹری چمک رہی تھی، گاڑی گزر چکی تھی

(۱۹۲۲ء)

اشکِ اوّلیں

خوشا وہ دن کہ شادابی تھی دلیں جب لڑکپن کی
بہاریں لوٹتی تھی جب وہ میرے ساتھ گلشن کی
کلی روحوں کی کھلتی تھی خنک جاڑوں کی راتوں میں
انگیٹھی کے کنارے نیند اڑجاتی تھی باتوں میں
ہوائے سرد کے جھونکے ہمیں بیخود بناتے تھے!
فرشتوں کی طرح، شفاف چشموں میں نہاتے تھے!
جب اوج چرخ پر ساون کے بادل گھر کے آتے تھے
ہوائے نرم میں کیا کیا نہ ہم دھومیں مچاتے تھے
میں پھر وں نیم کے نیچے اسے جھولا جھلاتا تھا
وہ گاتی تھی، مگر اس کو نہ کچھ آتا، نہ جاتا تھا۔
خفا ہوتے تھے تو اک دوسرے کا منھ چڑھاتے تھے۔
گھروندے صحن میں بن بن کے اکثر لوٹ جاتے تھے۔
نہ دن کو دل دھڑکتا تھا، نہ شب کو آنکھ روتی تھی

کسے معلوم تھا، اک روز نہ ہوگی سر گرانی بھی
دبے پاؤں چلی آتی ہے تیزی سے جوانی بھی

زمیں پھرتی رہی، ذرات میں ہوتی رہی گردش
اسی کے ساتھ محسوسات میں ہوتی رہی گردش

بھرے ظالم کے شانے کشتیٔ طفلی کے کھینے سے
کلی کھلتی رہی جلوؤں کی پیہم سانس لینے سے

جوانی سینۂ طفلی میں اٹھلاتی رہی برسوں
کوئی مبہم تمنا دل کو گرماتی رہی برسوں

مچلتا سا رہا ذوقِ تماشا آنکھ کے تل میں
تڑپ پھرتی رہی اک غیر محسوس آرزو دل میں

زمینِ برف میں تخم شرر بوتی رہی بجلی
تنِ نازک میں رفتہ رفتہ حل ہوتی رہی بجلی

جلا ہوتی رہی پردے ہی میں زلفِ پریشاں پر
زمرد کے ورق چڑھتے رہے رخسار تاباں پر

لب و رخسار کو دیتی رہی درسِ درخشانی
دلِ نازک کے نامعلوم ارمانوں کی جولانی

(۲)

نہ دیکھی تھی ابھی دنیا، سمجھ لیتا میں یہ کیونکر
کہ کچھ دن میں سفر سے کوئی پلٹے گا جواں ہوکر

نظر جو اب اٹھائی تو یکایک دیکھتا کیا ہوں
کہ میں تنہا ہزاروں بجلیوں کی زد پہ بیٹھا ہوں

وفورِ ناز سے جھکتے پہ ہیں نبضیں محبت کی
شناسائی کے ماتھے پر ہیں لہریں اجنبیت کی

نظر میں مضمحل ہیں چشمکیں اگلے زمانے کی
لبِ نازک پہ ہے سکتے میں عادت مسکرانے کی

خلافِ رسم یہ عالم جو میرے روبرو آیا
معاً آنکھوں میں اشکِ اولینِ آرزو آیا

نظر پہلے تو آئی اک چمک آنسو کے محمل میں
یکایک کھل گیا پھر اک دریچہ سارے دل میں

حریمِ جاں کی میں نے اس دریچے سے زیارت کی
نظر آئی مجھے خونیں کفن، دیوی محبت کی

بقا کے پھول کو تابوت پر کھلتے ہوئے دیکھا
اجل کو زندگانی سے گلے ملتے ہوئے دیکھا

صدائیں گونج اٹھیں دل میں ہزاروں آبشاروں کی
ہوا چلنے لگی سینے میں لافانی بہاروں کی

معاً اک آگ سی سوزِ دروں نے دل میں بھڑکائی
تمنا کسمسائی، غم نے لی سینے میں انگڑائی

مرے پہلو میں پہلی مرتبہ اک پھانس سی کھٹکی
گھٹا سی چھا گئی دل پر، کلی سی روح میں چٹکی

نرالا خوف، انوکھی کشمکش، ناآشنا ہلچل
گرجتے ہوں کہیں کچھ دور جیسے خواب میں بادل

دکھائی اک نئی دنیا نے کچھ یوں بزم آرائی
یکایک آئے چشمِ کور میں جس طرح بینائی

جہاں کا ذرہ ذرہ دیدۂ حیراں نظر آیا
بس خود اپنے کو اک ذرہ ہوا انساں نظر آیا

وہ بھڑکی آگ سینے میں، رگ و پے کو تپا ڈالا
زباں سے یہ مری بیساختہ نکلا "جلا ڈالا"

یہ سنتے ہی جبینِ حسن پر پہلی شکن آئی
جلو میں سیکڑوں جلوے لئے گویا دلہن آئی

غرورِ حسن نے بگڑے ہوئے انداز سے دیکھا
نیازِ عشق صدقے ہو گیا، اس ناز سے دیکھا

کہا کچھ زیرِ لب، زلفیں ہٹا کر روئے تاباں سے
مہک دوشیزگی کی آئی لعلِ عطر افشاں سے

جوانی گومگو میں پڑ کے غش کھانے لگی گویا
جماہی کی طرح لی سانس، نیند آنے لگی گویا

نظر میں آ گیا رنگِ تمنا کھنچ کے سینے سے
گلابی ہو گیا کچھ اور بھی چہرہ پسینے سے

بچا کر آنکھ پھر کھا اس نے میرے دل کی حالت کو
ادا سے پھیر کر آنکھوں پہ انگشتِ شہادت کو

اٹھا لیں انگھڑیاں زرخ سے ہٹا کر کاکلِ مشکیں
نظر میں یادِ ایامِ طرب تے کر دیں بالیں

یکایک کھنچ گیا دل میں تخیل کج ادائی کا
لبوں پہ آ چلا کچھ کچھ تبسم دلربائی کا

خفیف ایک رنگِ الفت حسن کے پندار میں جھلکا
تصورِ صحبتِ دیرینہ کا رخسار میں جھلکا

سنم ہی ڈھا دیا بھولے سے عریاں ہو کے باہوں نے
بقدرِ یک نظر تقریر کی نیچی نگاہوں نے

گلے پر ہمدمِ طفلی کے تیغِ خوں فشاں پھیری
ذرا سا مسکرا کر سرخ ہونٹوں پر زباں پھیری

مٹا ڈالا ہے جس ظالم نے میری شادمانی کو
الٰہی! خیر کی توفیق دے، اس کی جوانی کو

★

کوہستانِ دکن کی عورت

یہ اُبلتی عورتیں، اس چلچلاتی دھوپ میں
سنگِ اسود کی چٹانیں، آدمی کے روپ میں

واہ کیا کہنا ترا، اے حسنِ ارضِ آفتاب
یہ برشتہ رنگ، یہ تپتے ہوئے رنگیں شباب

ہر سراپا بت تراشوں کی عرق ریزی کا پھل
اتنی بے پایاں صلابت پر بھی ہر نقشہ سجل

چال، جیسے تند چشمے تیوریاں، جیسے غزال
عارضوں میں جامنوں کا رنگ آنکھیں بے مثال

عورتیں ہیں، یا کہ ہیں برسات کی راتوں کے خواب
پھٹ پڑا ہے جن پہ طوفاں خیز پتھریلا شباب

سیہ جواں چہرے، یہ چہروں میں برنائی کا جوش
تو کہے آہن میں کھودے ہیں کسی نے چشم و گوش

جسم ہیں کچھ اسقدر ٹھوس، الحفیظ و الاماں
لیجے چٹکی، تو چھل جائیں خود اپنی انگلیاں

مچھلیاں شانوں کی ابھری سی بٹی سی کاکلیں
آہنیں و فولاد کے پٹھے، سلاخوں کی رگیں

دید کے قابل ہے ان کافرتنوں کا رنگ روپ
کھپ چکی ہے جس میں بارش، ڈس چکی ہے جسکو دھوپ

ان بناتِ کوہ کی کڑیل جوانی، الاماں
پتھروں کا دودھ پی کر ہوئی ہیں جو جواں

کنکروں کے فرش پر دنیا سلاتی ہے جنہیں
آندھیوں کے پالنے میں نیند آتی ہے جنہیں

کیا خبر، کتنے دلوں کی جوش پامالی ہوئی
ان اداؤں سے کہ طوفاں کی ہیں پالی ہوئی

حُسنِ بیمار

کیا غضب ہے حسن کے بیمار ہونے کی ادا
جیسے کچی نیند سے بیدار ہونے کی ادا

انکسارِ حسن، پلکوں کے جھپکنے میں نہاں
نیم وا بیمار آنکھوں سے مروت سی عیاں

جنبشِ مژگاں میں غلطاں سازِ غم کا زیر و بم
خامشی میں پرفشاں ایفائے پیماں کی قسم!

احترامِ عشق کی رو، دلنشیں آواز میں
ایک پھیکے پن کا سناٹا دیارِ ناز میں

الاماں آنکھوں کی نیم افسردہ سی افسوں گری
ایک دھندلا سا تبسم، اک تھکی سی دلبری

چوڑیاں ڈھیلی، دلائی پُرشکن، ماتھے پہ ہات
لب پہ خشکی، رخ پہ سوندھا پن، نظر میں التفات

ہلکی ہلکی جھلکیاں رخسار و پر یوں نور کی سے
جیسے گل پر، صبحِ کاذب کی سہانی چاندنی

لے رہا ہے کروٹیں عارض میں یوں رنگِ شباب
جس طرح موجِ خراماں پر ضیائے ماہتاب

حسن یوں کھویا ہوا سا بزمِ محسوسات میں
جیسے دو دلوں وقت ملتے ہوں بھری برسات میں

یوں ہے اک روشن نمی سی چشمِ سحر انداز میں
صبح کو شبنم ہو جیسے معرضِ پرواز میں

جیسے بکھرے ہیں کوئی تابندہ منظر دور کا
جیسے پچھلی رات کے سینے پہ ڈورا نور کا

ایسے اضمحلال پر دنیا کی برنائی نثار
ایسی بیماری پر اعجازِ مسیحائی نثار

☆

جوانی کا تقاضا

منھ اندھیرے، تھی جب آویزش سی مہر و ماہ میں
مہترانی اک نظر آئی مجھے کل راہ میں
چھاؤں میں تاروں کی کچی نیند سے چونکی ہوئی
اک قدم پر جاگتی، اک گام پر سوتی ہوئی

رنگ سا اک شہپا پائے بے پاپوش پر
رُخ پہ نیندیں، لٹ گئی ساری کا پلو دوش پر
چال اٹھلائی ہوئی، گردن کا خم مستانہ وار
انکھڑیوں میں ننگ کوچوں کے تصور کا غبار

لیکن اس عالم میں بھی اے محو فطرت ہمنشیں
غم کا کوئی خار، پیشانی کے پھولوں میں نہیں
دیدنی ہے تلخ پیشے کا یہ اندازِ طرب
اک چمک سی انکھڑیوں میں اک لے سی زیرِ لب

سچ ہے طوفانِ جوانی کو دبا سکتا ہے کون
سرِ شبابِ شعلہ پرور کا جھکا سکتا ہے کون

بہتر یہی ہو کہ روانی گنگنائے گی ضرور
کچھ بھی ہو جائے، جوانی گنگنائے گی ضرور

(۱۹۳۴ء)

مشغلے کا اثر

دیکھتا تھا روز اک عورت کو میں وقت سحر
بورئیے بُنتے ہوئے پتلی گلی کے موڑ پر

سر سے پا تک بستۂ محویتِ اندوہناک
خال و خد پر ظلمتِ سنجیدگی و انہماک

شوق اس عورت میں روحِ ناز پاتا ہی نہ تھا
دل لبھانے کا کوئی انداز پاتا ہی نہ تھا

لیکن اک دن صبح کو، چھائی ہوئی تھی جب گھٹا
موڑ پر میں دفعتہً حیران ہو کر رہ گیا

دیکھتا کیا ہوں وہی "عورت" بصد انداز و ناز
چمپئی ماتھے پہ بکھرائے ہوئے زلفِ دراز

عشوۂ تبسم کا نہ کے ساتھ، ایک ظرفِ تنگ میں
دے رہی تھی ڈوب ساری کو گلابی رنگ میں

دل پکارا آج کیسی آگ سی بھڑکی ہے یہ ؟
مجھ پر اس دن یہ کھلا "عورت" نہیں لڑکی ہے یہ

(۱۹۳۴ء)

☆

شاعر کی نماز

اک زنِ کم رُو، سحر کو آئینے کے سامنے
ہات میں کنگھی لئے، کھڑکی کا پٹ کھولے ہوئے

دیر سے سلجھا رہی تھی کاکلِ پُر پیچ و خم
لے رہا تھا آنکھ میں لہریں مگر سیلابِ غم

آئینے سے کہہ رہی تھی چشمِ حسرت آفریں
اس کرے پر کوئی میرا پوچھنے والا نہیں

کس قدر قحطِ خریداری نے ہلکا کر دیا
تجکو اے میری جوانی کی متاعِ بے بہا!

یہ مرے گیسو، یہ لب، یہ چشم، یہ رُخ، دہن
آہ یہ برنائیاں، اور اس قدر رنج و محن

اس زمیں پر جستجوئے جلوۂ رنگیں نہیں
پھول تو موجود ہے۔ لیکن کوئی گلچیں نہیں

اس سماں سے قلب شاعر ہو گیا زیر و زبر
اور کچھ اس پیار سے ڈالی بناوٹ کی نظر

عارضِ شب رنگ پر سرخی نمایاں ہو گئی
بات تیغے پر گیا، تلوار عریاں ہو گئی!

آنکھ کے پردوں میں گویا شہد سا گھلنے لگا!
سانس کچھ اس ناز سے لی۔ رنگ رخ کھلنے لگا

خشک ہونٹوں پر تبسم رنگ برسانے لگا!
خال و خد کی گتھیاں پندار سلجھانے لگا!

عشوہ، سرخی سی، سر چہرے پہ دوڑانے لگا
ظلمتوں میں آبِ حیواں ناز فرمانے لگا

اک ذرا گھرا سا ہو کر ہر نفس آنے لگا!
ناز سے انگڑائی لی۔ آنکھوں میں رس آنے لگا

صبح کی تنویر، شبنم سے گلے ملنے لگی!
مس کیا بادِ سحر نے اور کلی کھلنے لگی

ہات میں، صیاد کا ندھے سے کماں لینے لگا
چشم و ابرو میں غرور انگڑائیاں لینے لگا

خود بخود آرائشِ کاکل سے شرمانے لگی
دست و پا میں ایک ہلکی لہر سی آنے لگی

دیکھ اے زاہد! کسے کہتے ہیں شانِ سوز و ساز
شاعرانِ پاک دل اس طرح پڑھتے ہیں نماز

(۱۹۲۷ء)

خمریات

خیز و در کاسۂ زر آب طربناک انداز
پیشتر ازانکہ شود کاسۂ سر خاک انداز

(حافظ)

وہ دخترِ رز کہ تھی خمِ رنگیں میں معتکف
صد شکر صدرِ انجمنِ کہکشاں ہے آج

اُف ری شمیم کاکلِ شب رنگ و بوئے عود
دوشِ صبا پہ دولتِ باغِ جناں ہے آج

رندوں کے ساتھ رحمتِ دو عالم ہے رقص میں
یومِ طوافِ کعبۂ رطلِ گراں ہے آج

ہر آرزو کے فرق پہ کج ہے کلاہِ ناز!
"عین الیقیں" بہشت کا وہم و گماں ہے آج

زیرِ نگیں زمیں ہے قبضے میں آسماں
آفاق پر حکومتِ پیرِ مغاں ہے آج

ہر خشک دفتر میں گونج رہی ہیں حکایتیں
ہر ذرۂ حقیر کے منہ میں زباں ہے آج

رہ رہ کے اڑ رہا ہے مسیح و خضر کا رنگ
کیا جانے کس لباس میں عمرِ رواں ہے آج

اے جوشؔ زلزلے میں ہے قصرِ تعینات
دل ماورائے قیدِ زمان و مکاں ہے آج

☆

یوم بہار

اے ہم نشیں! وہ جوشِ نئے ارغواں ہے آج
صہبا کی ایک بوند میں کون و مکاں ہے آج

ہر غنچہ کہ رقص کناں ہے بہ طرحِ نو!
چشم و چراغ سلسلۂ قدرسیاں ہے آج

جس پر نثار موجۂ تسنیم و سلسبیل
بکھری ہوئی وہ کاکلِ عنبر فشاں ہے آج

اللہ رے سیلِ نغمہ و طوفانِ رنگ و بو
موجِ ہوا میں جنبشِ نبضِ جواں ہے آج

شکرِ خدا کہ طرّۂ طرفِ کلاہ دوست
مشعلِ فروزِ مجلسِ روحانیاں ہے آج

پھر چہرۂ بشر پہ ہے رنگِ الوہیت
پھر فرشِ خاک پر سرِ کرّوبیاں ہے آج

اوجِ فلک پہ موجۂ ابر سبک خرام
صحنِ چمن میں جلوۂ سروِ رواں ہے آج

چند جرعے

جرعۂ اول

تعالی اللہ شانِ بادہ خواری
نئی ہلچل، نرالی بے قراری

کوئی کروٹ سی دل میں لے رہا ہے
لہو میں کشتیاں سی کھے رہا ہے

یہ کس کی سن رہی ہے روح آہٹ
رگوں میں ہے مزے کی سنسناہٹ

چمکتی ہیں فضائیں بجلیاں سی
لچکتی ہے رگ و پے میں کماں سی

یہ ہے رفتارِ خونِ زندگانی
بغیر اسباب شادی شادمانی

نئی شکلیں ہیں سینے پر منقش
مبارک امتزاجِ آب و آتش

پیے بیٹھا ہوں آج اے زاہدِ خام
شرابِ رند خوار و ساغر آشام

ادھر ہنگامۂ صہبا پرستی
ادھر آویزشِ تمکین و مستی

سخن کی داد خود دے پا رہا ہوں
کلی کی طرح کھلتا جا رہا ہوں

اٹھا ساغر کی پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ از زہدِ ریائی

جرعۂ دوم

رگ و پے میں ہے غلغلۂ نوجوانی — ہر اک لمحہ ہے عمرِ جاودانی
نئی تلخی میں ہے روح ترسال — تپاں ہے ماضی و مستقبل و حال
ترانے وقت سے آزاد ہو کر — ہوئے ہیں ساز کے پردوں سے باہر
گھٹا سی اک سنہری آ رہی ہے — بکھرتی پھر بکھرتی آ رہی ہے
گراں زنجیرِ دانش گل رہی ہے — متانت کی جوانی ڈھل رہی ہے
ہواؤں میں ہیں شاہانہ ترانے — اُبلتے ہیں گلابی سے خزانے
سبو کی آن سے دہکے ہوئے ہیں — فضا میں پھول سے مہکے ہوئے ہیں
چمن پر دوڑتی ہے روشنی کی گرد — صراحی دے رہی ہے پھولوں کی خوشبو
کبھی ظلمت کبھی انوار ہوتا ہے — خدا معلوم بیداری ہے یا خواب
یہ کیسی طرزگی ہے آج ساقی — صراحی میں ہے نور جیسے باقی

اٹھا ساغر کہ پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ از زہدِ ریائی

جرعۂ سوم

تعالی اللہ شان مے پرستی
گھٹا سی ہے گھر چھتی ابر برستی

ندی ساون کی چڑھتی آ رہی ہے
سوئے میخانہ بڑھتی آ رہی ہے

اٹھی ہیں جھومتی کالی گھٹائیں
گھٹائیں، شوخ ہنزالی گھٹائیں

اُبلتی ہے شراب ارغوانی
برستا ہے مزے سے لے کے پانی

سر میخانہ حوریں آ رہی ہیں
ذکائیں، رام رس ٹپکا رہی ہیں

ہر اک ذرے میں جذبات ترنم بانی
زمین پر لوٹتی پھرتی ہیں تانیں

فنا کی بیڑیاں پھر گل رہی ہیں
بقا کی مشعلیں پھر جل رہی ہیں

ہر اک ذرہ کھلا جاتا ہے گویا
گلے آ کر ملے جاتا ہے گویا

بڑھا جاتا ہوں دریا ہو کہ وادی
مبارک دولت خود اعتمادی

ہوائیں چل رہی ہیں سنسناتی
مہکتی، سرسراتی، گنگناتی

شریعت پر تباہی آ رہی ہے
مشیت کو ہنسی آ رہی ہے

اٹھا ساغر کہ پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ انداز برنائی

جرعۂ چہارم

عجب شان نہ کیفیت ہے طاری
ستاروں پہ ہے میرا حکم جاری

زمیں سوفتہ اک وہم و گماں ہے
مرے شہپر کے نیچے آسماں ہے

ابد کا نور رقصاں ہے جبیں پہ
خلا ہے وقت کے سینے کے اندر

ہر اک لمحہ ترانے گا رہا ہے
زمانہ یوں نکھر کر چھلکا رہا ہے

برستے ہیں فسوں پیرو ترانے
اُبلتے ہیں جوانی کے نسلے

مجازی صورتوں پر ہے جمالی
حقائق ہو چکے ہیں لاابالی

لپکتے، رقص کرتے، لڑکھڑاتے
اکٹھے ہیں مغنّی دھومیں مچاتے

چھنکتی ہیں تبول کی بالیاں سی
فضا پر بج رہی ہیں تالیاں سی

جوانی روح میں اٹھلا رہی ہے
نظر پر کاکلیں بکھرا رہی ہے

نہ دل کو امتیاز این و آں ہے
نہ خود پہ بندہ ہونے کا گماں ہے

اٹھا ساغر، کہ پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ از زہد ریائی

جرعۂ پنجم

تعالی اللہ شکستِ خود نمائی
بھرا ہے خاک میں زورِ خدائی

فلک پر نشہ سا چھایا ہوا ہے
زمیں کو حال سا آیا ہوا ہے

جوانی ہے زمیں سے آسماں تک
برابر آسماں سے لامکاں تک

چمن میں فصلِ گل اٹھلا رہی ہے
ہوا پر عمرِ رفتہ گا رہی ہے

ہتھیلی پر لیے ہوں گلستاں کو
کہاں کا گلستاں، سارے جہاں کو

فلک حیرت سے منہ کھولے ہوئے ہے
پیامی آ رہے اور جا رہے ہیں

فرشتے ہر طرف منڈلا رہے ہیں
پیامی آ رہے ہیں، جا رہے ہیں

نظر میں صورتیں سی پھر رہی ہیں
نقابیں اٹھ رہی ہیں، گر رہی ہیں

شریعت سے کنارا ہو چکا ہے
مشیت کا اشارا ہو چکا ہے

جبینِ "حال" پر ہے نقشِ "ماضی"
کوئی حد بھی ہے ان بدمستیوں کی

زمانے کے بعید و متصل مست
دماغِ عقلِ پیر و مست، دل مست

بقا مست و حیاتِ جاوداں مست
بتِ نوخیز و صہبائے کہن مست

ہوائے تاک و برگ یاسمن مست
بتِ نوخیزہ صہبائے کہن مست

بلند و پست مست و تیرہ و گل مست
عنادل مست گل چیں مست گل مست

شگوفہ مست و گل مست و چمن مست
زباں مست و بیاں مست و سخن مست

نظر مست، حکمت مست، دین مست
عقائد مست، ظن مست و یقین مست

ملک مست و فلک مست و قضا مست
قمر مست و فضا مست و صبا مست

مغنّی مست، بربط مست، نے مست
سبو کش مست، ساغر مست، مے مست

خذف مست و صدف مست و گہر مست
شرر مست و حجر مست و شجر مست

جہاں مست و زماں مست و مکاں مست
عناصر مست، جوہر مست، جاں مست

رواجِ خیر مست و رسمِ شر مست
سفالیں کوزہ مست و کوزہ گر مست

یہ ہے بدمستیوں کا زور ساقی
محیطِ غیب میں ہے شور ساقی

مجھے ارض و سما سے کد نہیں ہے
وگرنہ مستیوں کی حد نہیں ہے

اگر چاہوں تو دنیا کو ہلا دوں
زمیں کیا، آسمانوں کو نچا دوں

فلک کیا، عرش کو بھی پست کر دوں
خودی کیسی، خدا کو مست کر دوں

شبِ نشاط

کیا میکدے کی رات نشاط آفریں ہے آج
گلرنگ موجِ بادہ سے ان کی جبیں ہے آج
ہر لغزشِ قدم سے ٹپکتے ہیں زمزمے
ہر جنبشِ نگاہ سرود آفریں ہے آج
شوخی سے ہمکنار ہے چشمِ حیا پرست
تمکیں سے بے خبر نگہِ شرمگیں ہے آج
ہر شے پر آسماں سے برستی ہیں رونقیں
ہر ذرّہ کائنات کا، اک نازنیں ہے آج
جس جام زر کو چومیے، لعلِ شکر فروش
جس مغبچے کو دیکھیے، زہرا جبیں ہے آج
چھپ چھپ کے پینے والوں کو ملتا نہیں ہے یار
مر مر کے جینے والوں کی پرسش نہیں ہے آج
پھیلی ہوئی ہے عرش سے تا فرش چاندنی
نیلم ہے آسمان، زمرد زمیں ہے آج

ا۔ میں نے اسی طرح دیکھا تھا۔ (جوش)

قند و شکر ہیں غرق ہیں کام و دہن تمام
خم میں شراب، تلخ نہیں، انگبیں ہے آج

ساقی کی لے میں بربطِ داؤد کا ہے سوز
صہبا کی بو میں نکہتِ خلدِ بریں ہے آج

ساغر سے رنگِ عارضِ سلمیٰ ہے آشکار
مینا میں حسنِ لیلیٰ محمل نشیں ہے آج

ساقی پہ اس بلا کی پھبن ہے کہ الاماں
قرباں اک نگاہ پہ دنیا و دیں ہے آج

چھائی ہوئی ہے ارض و سما پر وہ بیخودی
تو یہ کہے کہ ہوش میں دنیا نہیں ہے آج

کیوں موجِ بادہ ہو نہ ثریا سے بھی بلند
پائے سبو پہ جبہ‌ٔ شوقِ سخن آفریں ہے آج

☆

آج کی رات

دیدنی ہے مری محفل کا سماں آج کی رات
موجِ صہبا میں ہے رقصِ دو جہاں آج کی رات

تل گیا ہے کوئی اس طرح گل افشانی پر
ذرے ذرے پہ ہے جنت کا گماں آج کی رات

قابلِ دید ہے بکھرے ہوئے پھولوں کی بہار
ہر شکن فرش کی ہے کاہکشاں آج کی رات

ایک موہوم سا نقطہ ہے جہاں ارض و سما
ایسا اک دائرہ ہے رطلِ گراں آج کی رات

اثرِ مے سے ہے پگھلا ہوا سونا گویا
عرق آلودہ رخِ سیم براں آج کی رات

پرتوِ بادۂ روشن سے ہے بے گرد و غبار
افقِ عربدۂ زہرہ وشاں آج کی رات

قابلِ ظلم نہیں فطرتِ خوباں اس وقت
قادرِ جور نہیں طبعِ بتاں آج کی رات

شمع ہے قابلِ پروانہ، آشفتہ مزاج
حسن ہے مائلِ صاحب نظراں آج کی رات

آب حیواں کا نہ کر ذکر کہ حاصل ہے مجھے
دولتِ قربِ مسیحا نفساں آج کی رات

جوئے کہسار کے مانند گزرتا عالم ہے
یہ ہے فرمانِ جہانِ گزراں آج کی رات

اُف ری ساحل پہ غزلہائے رواں کی ہلچل
اک تلاطم ہے سرِ آب رواں آج کی رات

غلغلہ ساز کا ہے، دیرِ مغاں سے لے کر
تا بہ خلوت گہِ حورانِ جناں آج کی رات

جیسے بھیگی ہوئی زلفوں کی مہک عود آمیز
نفسِ شام ہے یوں مشک فشاں آج کی رات

خادمانِ درِ ساقی کے سروں پر کج ہے
کلۂ خواجگیٔ کون و مکاں آج کی رات

حلقہ باندھے ہوئے میخواری سرگرمِ طواف
جوشؔ ہے قبلۂ رندانِ جہاں آجکی رات

(۱۹۴۳ء)

کل رات

دیدنی تھا میری محفل کا سماں کل رات کو
مہرباں تھا وہ مجسمِ نامہرباں کل رات کو
"ناز" تھا طغرائے کشِ دیوانِ آدابِ نیاز
"تیغ" تھی پیغمبرِ امن و اماں کل رات کو
چھو رہی تھی دل کو موجِ رنگِ تیروں کے عوض
کھنچ رہی تھی ابروؤں کی یوں کماں کل رات کو
لوٹتی تھی کس تکلف سے ہوا کے دوش پر
چاندنی میں کاکلِ عنبر فشاں کل رات کو
اللہ اللہ فرشِ مے نوشی کی اوج اندیشیاں
فرش پا انداز تھا کون و مکاں کل رات کو
الاماں ٹھنڈی ہوا کے گدگدانے کی ادا
ہر کلی کو آ رہی تھیں ہچکیاں کل رات کو
مستند تحریریں پہ "سرِ دلبراں" کے زمزمے
تھے بہ "اندازِ حدیثِ دیگراں" کل رات کو

کاکلیں لہرا رہی تھیں روئے عالم تاب پر
سنبلستاں کا سماں تھا گل پر سایاں کل رات کو

پھول تھے غرقِ عرق، پانی ہوئے جاتے تھے جام
سرخ تھیں اس شوخ کی یوں انکھڑیاں کل رات کو

آرہی تھی جنبشِ مژگانِ عالم کی صدا
یوں لبِ گل رنگ تھا افسانہ خواں کل رات کو

کیا تلاطم تھا کہ میری کشتیٔ امید میں
کاکلِ شبرنگ کا تھا بادباں کل رات کو

غیب کے پردے سے آوازیں مبارکباد کی
آرہی تھیں کارواں در کارواں کل رات کو

سامنے تھی جلوہ گاہ کرسی و لوح و قلم
اک دریچہ بن گیا تھا آسماں کل رات کو

ہر سخن میں گونجتی تھی اسمِ اعظم کی صدا
ہر نفس تھا اک حیاتِ جاوداں کل رات کو

وقت کے ہاتھوں پہ روشن تھیں ابد کی مشعلیں
ایسی اک منزل میں تھی عمرِ رواں کل رات کو

وہ ترنم تھا کہ علم و عقل کے ہوتے ہوئے
زیست کی مے شے تھی اک جنسِ گراں کل رات کو
چاندنی، دریا، شگوفے، راگنی، بربط، شراب
پھٹ پڑی تھیں بزم پر رنگینیاں کل رات کو
نرگس مخمور، دآبِ آتشیں و موجِ گل سے
ہر طرف تھیں سرخیاں ہی سرخیاں کل رات کو
گردنِ مینا جھکاتے ہی ابل پڑتے تھے جام
گنگنا اٹھتا تھا یوں پیرِ مغاں کل رات کو
وجد میں تھی جھلملاتی مشعلوں کی روشنی!
رقص میں تھا پرتو رطل گراں کل رات کو
ناز کرتی جس طرح گردوں پہ جاتی ہے دعا
اٹھ رہا تھا شعلوں سے یوں دھواں کل رات کو
محفل زہرا میں تھا ہنگامۂ رقص و سرود
آسماں پر بج رہی تھیں چوڑیاں کل رات کو
میں بھی لافانی ہوں مثل وجہِ ربِ ذوالجلال
دل کو ہوتا تھا یہ رہ رہ کر گماں کل رات کو

جوشؔ کے پہلو میں تھیں ارض و سما کی نعمتیں
حیف! اک تو ہی نہ تھا اے راز داں کل رات کو

(۱۹۳۴)

☆

رقاصۂ میکدہ

کل رات کو ساقی نے عجب دھوم مچادی
آنکھوں میں جو کھنچتی ہے وہ صہبا بھی پلادی

مے ناز کی نزدیک سے چھلکا کے دمِ رقص
بو دور سے مہکی ہوئی زلفوں کی سنگھادی

آنے لگیں ہونٹوں پہ تبسم کی جو لہریں
رُو کوثر و تسنیم کی آنکھوں میں دکھادی

سر کیف میں تھوڑا سا جھکا، اور اٹھی آنکھ
گویا درِ مے خانہ کی زنجیر ہلادی

سینے پہ پڑا سر کے جھکانے سے جو سایہ
اس سایۂ شبگوں نے مری روح جگادی

سرشار جوانی کی وہ بدمست لگاوٹ
لہجے نے چھپائی تو نگاہوں نے بتادی

مستانہ غزل چھیڑ کے بیلا جو اٹھایا
"قربان تری آواز کے" زہرا نے صدا دی

نظروں کو کیا شوخی نے کبھی آزاد
پلکوں کو حیا نے کبھی زنجیر پنہادی

آشفتہ مزاجوں کو کبھی ناز سے دیکھا
گستاخ نگاہوں کو کبھی آنکھ دکھادی

دنیا کا کوئی ساز جسے پا نہیں سکتا
ہونٹوں پہ زباں پھیر کے وہ دھن سنادی

انگڑائی جو آئی تو کچھ اس ناز سے دیکھا
آنکھوں نے کیا شکر، تمنا نے دعا دی
المختصر آنکھوں میں مری ڈال کے آنکھیں
معلوم نہیں آگ لگا دی کہ بجھا دی

کیا بات ہے اے جوشؔ! ترے مست قلم کی
تو نے تو شبِ قدر نگاہوں سے کرا دی

جشنِ نو

پھر طرزِ نو سے زینتِ صحنِ چمن ہے آج
گلشن میں کجِ کلاہ گل و یاسمن ہے آج
پھر جامِ زر میں جمع ہے صہبا و نورِ ماہ
پھر اتصالِ جلوۂ گنگ و جمن ہے آج
پھر اہلِ دل کی عقدہ کشائی کے شوق میں
سرگرمِ نازِ زلفِ شکن در شکن ہے آج
تمہیدِ شرحِ صدر ہے پھر شغلِ مے کشی
پھر برقِ طور موجِ شرابِ کہن ہے آج
پھر عکسِ زلفِ یار ہے قلبِ فگار پر
پھر ابرِ سبزہ صدر نشینِ چمن ہے آج
پھر بوستاں میں طرۂ طرفِ کلاہِ دوست
وجہِ فروغِ افسرِ سرِ دشمن ہے آج
پھر خدمتِ نیاز پہ مائل ہے روحِ ناز
پھر زانوئے صنم پہ سرِ برہمن ہے آج
لرزاں تھی جس کے وعدۂ فردا سے زندگی
پہلو میں پھر وہ شاہدِ پیماں شکن ہے آج

زخمِ نگاہِ بد سے بچائے رہے خدا
دیکھو تو کوئی جوشؔ پہ کیا بانکپن ہے آج

ایک تمنّا

عیدِ گُل ہو اور ہجومِ ساقیانِ سیم ساق / ایسی اک گردش کبھی ہالے گنبدِ فیروزہ طاق

یوں بساطِ عیش پر ہو چنگ و بربط کا خروش / لحن میں تبدیل ہو جائے فغانِ اشتیاق

اپنے اپنے طرز میں ہو ہر شریکِ بادہ فرد / اپنے اپنے رنگ میں ہو ہر حریفِ کیف طاق

راگ کے شعلوں سے دنیا کو بنا دیں یوں رفیق / زاہدوں کے آہنیں سینوں میں گل جائے نفاق

جرأتِ رندانہ و جوشِ جنوں ہو صدرِ بزم / رکھ دیا جائے خرد کا آئینہ بالائے طاق

جھوم کر چھا جائیں مستی کی گھٹائیں روح پر / کیسی دنیا بلکہ خود عقبیٰ کو بھی دے دیں طلاق

گائیں، اترائیں، لڑکھڑائیں، گنگنائیں نازنیں / دلبرانِ شوخ نوشیں بہ مہ وشانِ چست و چاق

کاکلِ برہم سے مہکے سینۂ موجِ صبا / قلقلِ مینا سے گونجے گنبدِ نیلی رواق

خرمنِ حکمت جلا دے مطربوں کی ترز نے / صولتِ عصمت مٹا دے میکشوں کا طمطراق

جیسے ہلکی نیند میں پانی برسنے کی صدا / یاد آئے وصل میں یوں گریۂ شامِ فراق

ایک شب کے واسطے جنت بنا لوں دہر کو
مہرباں ہو جائے کاش اے جوش بخت و اتفاق

دعوتِ ناؤنوش

اٹھ کہ اے ساقی بدل دیں راہ و رسمِ کفر و دیں
یہ گھٹائیں، اور پھر تقویٰ! نہیں، ہرگز نہیں
آ کہ پھر لرزاں ہے کوئل کی صدائے آسماں
اٹھ، کہ پھر رقصاں ہے ابرِ بادِ صحنِ زمیں
آ، کہ پھر دریاں مچلے پر تو رد ئے جبیں!
اٹھ، کہ پھر ساغر میں کھیلے عکسِ زلفِ عنبریں
کوکتا ہے پھر پپیہا، جھومتی ہے پھر گھٹا
توڑ دے مہرِ خموشی، کھول دے چینِ جبیں
محوِ عشرت ہو بہ فرمانِ شبابِ عشوہ کار
گرمِ جلوت ہو بہ زعمِ زاہدِ خلوت نشیں
آ پلا اپنے گدا کو آج ساقی! بول شراب
آسماں ہو جائے نالو میں زمیں زیرِ نگیں
اس جنوں سے کر مجھے سرشار جس کے اثر سے
لرزہ بر اندام ہو جاتی ہے عقلِ اوّلیں

مطربِ رنگیں! بتا دے راہِ صورت سرمدی
قلقلِ مینا! سنا دے نغمۂ روح الامیں

توبہ توبہ فصلِ گل ہیں، اور میں توبہ کروں
ہیں کوئی کافر نہیں، الحمد رب العالمین

اس بھری برسات میں طوفان بن کر بے پلا
کھول دے پُر پیچ و خم زلفیں، اللہ رے آستیں

تند جھونکے، تیز بارش، مست بادل، سرخ جام
آج اے ساقی! زمانہ ہوش میں گویا نہیں

فرصتِ عشرت غنیمت ہے، خدارا ہوشیار
زندگی ہے تیغ بر دست و کفن در آستیں

ناز کر اے یار! اپنی دلبری پر ناز کر
جوش سا مغرور ہے تیرا غلام کمتریں

پیامِ کیف

علی الصباح کہ موجِ صبا تھی عنبر بیز
سمندِ فکر کو رقصِ نسیم تھا مہمیز
کھلا رہی تھی شگوفے صبا کی گرمئ ناز
تپا رہی تھی گلوں کو نمو کی آتشِ تیز
سماں تھا وادئ کہسار کا نشاط افروز
ادا تھی سرو و گل و یاسمن کی ولولہ خیز
دل و دماغ پہ چھایا ہوا تھا کیفِ سحر
کہ لائی موجِ صبا یہ پیامِ کیف آمیز
"تجھے خبر بھی ہے، اے نو اسیرِ کاکلِ دہر!
کہ ہر نفس ہے یہاں اک طلسمِ حیرت خیز
نظر کی ہے غلطی تختِ قیصر و جمشید
سراب کی ہے چمک تاجِ نادر و پرویز
زمینِ حرص پہ رکھیو ذرا سنبھل کے قدم
کہ اس زمیں پہ ہے خوابیدہ فتنۂ چنگیز

مذاقِ زہد بھی ناقص کہ شیخ کی ہے بساط
رکوعِ کید سرشت و سجودِ مکر آمیز

شرابِ ناب طلب کر کہ تجھ پہ کھل جائے
کہ آسماں گہر افشاں زمیں ہے نکہت بیز

انڈیل ساغرِ زریں میں آتشِ سیال
جو چاہتا ہے کہ ہو نبض شادمانی تیز

وہ انجمن ہے حریفانِ بادہ پیما کی
جہاں دوا سے ہے نفرت، دعا سے ہے پرہیز

وہ سرزمینِ ابد ہے دیارِ مے نوشی
جہاں ہے وقت سے ہر لمحہ گرمِ ستیز

وہ آستاں ہے شبستانِ بادہ خواری کا
جہاں سجود میں ہے بیمِ صبحِ رستاخیز

کسے نصیب یہ دو نعمتیں زمانے میں
شرابِ کہنہ و گل بانگِ ساقیِ نوخیز

فدائے دامنِ صد چاک مے گساراں باد
"ہزار جامۂ تقویٰ و خرقۂ پرہیز"

(حافظ)

جواب اس شب کا دنیا میں نہیں ہے

جواب اس شب کا دنیا میں نہیں ہے
مرے پہلو میں پھر وہ نازنیں ہے

فضا پر کھیلتی ہے نوجوانی
ہوا میں مستی وجد آفریں ہے

سبک فانوس میں طرار شعلہ
بہ رنگِ یوسفِ زنداں گزیں ہے

گلابی میں شرابِ ارغوانی
بہ نازِ لیلیٰ محمل نشیں ہے

معاذ اللہ یہ رنگیں فضائیں
نہیں، دنیا نہیں، خلد بریں ہے

جنوں انگیز کاکل کی درازی
شکستِ زہد کوتہ آستیں ہے

قریبِ شام جیسے غنچۂ گل
گلابی یوں وہ چشم سرمگیں ہے

وفورِ کیف میں احساسِ مستی
گماں سا ہے گماں میں کچھ یقیں ہے

دمک اس رخ پہ کچھ ایسی ہے گویا
زمانے کی صباحِ اولیں ہے

تجلی ظلمات میں ہے آبِ حیواں
سیہ کاکل کے سائے میں جبیں ہے

مری نظروں کے آگے سرخوشی ہیں
حجابِ زندگی باقی نہیں ہے

عیاں ہے جوہر بالائے گردوں
نمایاں دولتِ زیرِ زمیں ہے

خدا کے واسطے خاموش زاہد
ترے لب پہ چناں ہے اور چنیں ہے

وہاں قہرِ خدا کا ذکر، کیا خوب!
جہاں قہرِ خدا مہر آفریں ہے

وہاں، ارض و سما کی شرح و تفسیر
جہاں ارض و سما زیرِ نگیں ہے

وہاں، اور موت کی تشریح پر ہوں
جہاں موت اک کنیزِ کمتریں ہے

یہاں وہ موت ہے اک وہمِ باطل
تجھے جس موت کا حق الیقیں ہے

خدا، تیرے تخیل میں ہے "قہار"
بشر، یاں "رحمۃ للعالمیں" ہے

یہاں "قہار" بن جاتا ہے "رحمٰن"
کہ یہ رندی ہے، درویشی نہیں ہے

یہاں ہر بوند میں ہے موجِ کوثر
یہاں ہر فرش پر عرشِ بریں ہے

یہاں ہر سانس ہے اک سیلِ الہام
یہاں ہر نقش، اک نقشِ نگیں ہے

یہاں کی شورشوں میں ہے ترنم
یہاں کی تلخیوں میں انگبیں ہے

یہاں ہر قہقہہ ہے لحنِ داؤد
یہاں ہر زمزمہ روح الامیں ہے

یہاں ہر سنگ ہے لعلِ بدخشاں
یہاں ہر خار رگِ یاسمیں ہے

یہاں کونین ہے اک موجِ صہبا
یہاں ارض و سما اک ساتگیں[1] ہے

یہاں ہر جام میں غلطاں ہے کوثر
یہاں ہر جیب میں خلدِ بریں ہے

یہاں ہر مطربِ حسن و جوانی
یکے از انبیائے مرسلیں ہے

یہاں ہر غلغلہ ہے خالقِ جاں
یہاں ہر ولولہ دہر آفریں ہے

تری دنیا ہے زشت و خوب میں گم
مری سرحد ورائے کفر و دیں ہے

مجھے ہر کلیہ ہے ظن و تخمیں
تجھے ہر واہمہ حق الیقیں ہے

۱؎ شراب کا بڑا پیالہ

ترا سر ہے شریعت کے قدم پر — یہاں پائے مشیت پر جبیں ہے
مرا پیمانہ ہے یزداں در آغوش — ترا احرام بت در آستیں ہے
ز ردِّ نصِ قرآں نفع مے سے — تجھے انکار کی جرأت نہیں ہے
ارے او عظمتِ عصیاں کے منکر — "گنا ہوں" پر مرے کیوں خشمگیں ہے

خلافت ارض کی بخشی ہے جس نے
وہ آدمؑ کا گناہِ اولیں ہے

ذرا تو دیکھ اس حسنِ جواں کو — تری آنکھوں میں بینائی نہیں ہے
نظر میں ہے فروغِ لالہ و گل — کمر پر موجِ زلفِ عنبریں ہے
تجمل میں ہے اک شانِ تبسم — تبسم ہے کہ موجِ انگبیں ہے
تکلم میں ہے نمکینِ خموشی — خموشی ہے کہ لحنِ دلنشیں ہے
تخاطب میں ہے اندازِ تغافل — تغافل ہے کہ چشمِ دور بیں ہے
معاذ اللہ یہ الھڑ بادہ نوشی — کہیں چادر ہے اور کاکل کہیں ہے
لہکتی، گنگناتی، لڑکھڑاتی — جوانی ہوش میں گویا نہیں ہے

صدا یہ دے رہا ہے طور سے کون
کوئی کہہ دو مجھے فرصت نہیں ہے

(۱۹۳۲ء)

صبح میکدہ

میخانے کو صبح جا کے دیکھا | عالم تھا سکوت خواب کا سا
ہلکی سی وہ روشنی گلابی | کہتی تھی کہاں گئے شرابی
تھیں فرش پہ سلوٹیں سی ہر سو | زانو سے ملے تھے شب کو زانو
پیدا تھا سکوت سے ترانہ | تھی فرش کی ہر شکن فسانہ
شیشوں سے جو مے چھلک گئی تھی | رودادِ نشاط کہہ رہی تھی
کچھ نقشِ قدم جہاں بنے تھے | سجدوں کے وہیں نشاں بنے تھے
حجروں کی ہوا بسی ہوئی تھی | خوشبو سے نئی جوانیوں کی
آتی تھی خموشیوں سے ہر بار | رقاصہ کے گھنگروؤں کی جھنکار
شیشوں کے خطوط میں بصد ناز | غلطیدہ تھی ہاؤ ہو کی آواز
گنبد میں تھی محوِ پرفشانی | اربابِ نظر کی آواز!
گلداں میں مچلتی تھیں زبانیں | پھولوں میں گھری تھیں داستانیں
لہریں سی ہوائیں لے رہی تھیں | ملبوس حریر و پرنیاں کے
بالائے ہوا تنے ہوئے تھے | دزدیدہ نگاہیوں کے چلے
غنچے سے فضا میں کھل رہے تھے | نظروں کے خطوط مل رہے تھے

آئینوں میں کچھ عیاں تھا کچھ گم — اک زہرہ جمال کا تبسم
وہ حجلۂ کیف جس میں شب بھر — تھا مطرب و مے سے ایک محشر
ہنستا ہی تھا، اور نہ رو رہا تھا — جاگا ہوا شب کا سو رہا تھا
نغمے کہ چھڑے رہے تھے شب بھر — آسودہ تھے بام و در کے اندر
حجرے میں تھی رات یوں سمائی — جاذب میں ہو جیسے روشنائی
یوں جذب کیے ہوئے تھے ذرات — انفاس و تبسم و خیالات

ذروں کو کوئی فشار اگر دے
پھر منعقد ایک بزم کر دے

(۱۹۳۶ء)

ھُو

نہ میکشوں کا وہ گلشن رہا، نہ لالہ رہا
نہ زاہدوں کا وہ زہد ہزار سالہ رہا!
نہ کوئی دفترِ آداب کا رہا نسخہ
نہ کوئی مصحفِ انداز کا رسالہ رہا
نہ سوز و ساز کا قایم رہا مقولہ کوئی
نہ علم و عقل کا باقی کوئی مقالہ رہا
نہ اہل عیش کے وہ دلفریب لحن رہے
نہ اہلِ درد کا وہ جانگداز نالہ رہا

حریفِ کیف میں تاریخِ رفتگان بن کر
رہا تو حضرتِ ساقی کا اک پیالہ رہا

پروگرام

(۱۹۳۴ء)

اے شخص! اگر جوشؔ کو تو ڈھونڈنا چاہے
وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملیگا

اور صبح کو وہ ناظرِ نظارۂ قدرت
طرفِ چمن و صحنِ بیاباں میں ملیگا

اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی
شہرِ ہنر و کوئے ادیباں میں ملیگا

اور شام کو وہ مردِ خدا، رندِ خرابات
رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں ملیگا

اور رات کو وہ خلوتیٔ کاکل و رخسار
بزمِ طرب و کوچۂ خوباں میں ملیگا

اور ہوگا کوئی جبر، تو وہ بندۂ مجبور
مردے کی طرح کلبۂ احزاں میں ملیگا

"وقت مُروت"

(۱۹۲۹ء)

علی الصباح کہ تھی کائنات سر بہ سجود — فلک پہ شورِ اذاں تھا، زمیں پہ بانگِ درود
بہارِ شبنم آسودہ تھی کہ روحِ خلیل — زروغِ لالہ و گل تھا کہ آتشِ نمرود
جلا رہی تھی ہوا، بزمِ جاں میں شمعِ طرب — مٹا رہی تھی صبا، لوحِ دل سے نقشِ جمود
گلوں کے رنگ میں تھی شانِ خندۂ یوسف — کلی کے ساز میں تھا لطفِ نغمۂ داؤد
ہر اک جبیں پہ درخشاں تھا نیرِ اقبال — ہر ایک فرق پہ تاباں تھا طالعِ مسعود
فضائے چرخ میں دوڑی ہوئی تھی روحِ ظہور — بساطِ خاک پہ چھایا ہوا تھا رنگِ نمود
دماغ سے جو ملاتی ہے دل کی سرحد کو — وہ راہِ عقلِ سبک سر جنوں سے بھی تھی مسدود
جبینِ خواب سے جو نکلے تھے رسمسائے ہوئے — مچل رہی تھی ہواؤں میں بوئے عنبر و عود
یہ رنگ دیکھ کے آیا مجھے خیالِ نماز — مری نماز، کہ ہے شاہد و شراب و سرود
مری نماز، کہ ہے مہوشوں سے رازِ نیاز — مری نماز، کہ ہے مغبچوں سے گفت و شنود
مری نماز، کہ ہے نغمۂ ہو الباقی — مری نماز، کہ ہے نعرۂ ہو الموجود
مری نماز، کہ ہے عشقِ ناظر و منظور — مری نماز، کہ ہے حُبِّ شاہد و مشہود
مری نماز، کہ ہے ایک سازِ لاآفاقی — مری نماز، کہ ہے ایک سوزِ لامحدود

مری نماز کہ ہے دیدِ رُوئے ناشستہ
مری نماز "نظر" شیخ کی نماز "الفاظ"
یہاں ہے رشتۂ انفاس میں ترنمِ دوستا
وہاں کشاکشِ اغراض سے غمِ کم و کیف
فغاں کہ "جنبشِ اعضا" وہاں اساسِ نماز
کسی مقام پہ حاصل نہیں قرار مجھے
غرضکہ آتے ہی وقتِ سحر خیالِ نماز
تمام رازِ نہاں کھل گئے مرے دل پر
سرِ نیاز سے ظاہر ہوا تبسمِ ناز
اٹھا کے پھر سرِ پُر شوق پائے جاناں سے
"بیا، بیا، کہ ترا تنگ در کنار کشیم"
مرے لبوں کو کبھی دے رخصتِ ترانۂ حمد
یہ سن کے شرم سے کوئی جواب بن نہ پڑا
حیا نے بڑھ کے پکارا "یہ کافرِ شیں بگڑ"

مری نماز کہ ہے طوفِ حسنِ خواب آلود
یہاں چراغ۔ وہاں صرف شمعِ کشتہ کا دود
وہاں ہے دائرۂ تسبیح پر مدارِ درود
یہاں لطافتِ احساس ہے زیاں بھی نہ سود
خوشا کہ لرزشِ دل ہے یہاں قیام و قعود
سحر کو ہوں حرمِ برہمن۔ تو شام کو محمود
جبیں جھکی پائے صنم پر، زباں پہ "یا معبود"
زِ تکیہ گاہِ عدم، تا بہ کارگاہِ وجود
بطونِ خاک سے پیدا ہوا اور مقصود
کہا یہ بیٹھ کے اے سروِ بوستانِ وجود
ز بوسہ مہر کنم بر لبِ شکر آلود
ہر ایک ذرہ ہے اس وقت آشنائے درود
جھکی نگاہ، جبیں ہو گئی عرق آلود
نظر نے جھک کے صدا دی یہ "کافرِ شیں بسود"

"دہانِ یار، کہ درمانِ درد حافظ داشت
فغاں کہ وقتِ مروّت چہ تنگ حوصلہ بود"

نوجوانی کے مزے

(۱۹۳۰ء)

یاد ہیں اب تک وہ عہدِ نوجوانی کے مزے
نوجوانی کے مزے کیا؟ زندگانی کے مزے

وصل کی یادِ خنک میں، ہجر کے طوفان میں
کامرانی کے مزے، ناکامرانی کے مزے

بسترِ حرماں پہ خونی کروٹوں کے سانحے
غم کی راتوں میں بلائے آسمانی کے مزے

بادلوں سے جھوم کر، سرشارِ ساغر چوم کر
جلوہ گاہِ رنگ و بو میں شعر خوانی کے مزے

موجِ بربط، موجِ گل، موجِ صبا کے سامنے
جامِ زرّیں و شرابِ ارغوانی کے مزے

صبح کی چاندنی میں شاخوں کے مچلنے کا سرور
شام کے سونے میں نہر کی روانی کے مزے

روز اک اندازِ نو سے باہزاراں طمطراق
حلقۂ احباب میں جادو بیانی کے مزے

مست راتوں میں یہ فیضِ ارتباطِ حسن و عشق
میہمانی کے مزوں میں میزبانی کے مزے

بارہا آ کے زیرِ سایۂ شمشیرِ یاس
شعلہ پرور ولولوں کی سخت جانی کے مزے

روٹھنے اور روٹھ کر منتے کے دورِ ناز میں
مہربانی کے مزے، نامہربانی کے مزے

صحبتِ ہمراز میں مکتوبِ رنگیں کی بہار
گوشۂ خلوت میں پیغامِ زبانی کے مزے

کمسنی کی خوابگاہوں میں پئے تکمیلِ شوق
جرعہ جرعہ عربی کے مے افسانہ خوانی کے مزے

بارگاہِ دلبری میں گاہ فرطِ رعب سے
نقش بر دیوار ہو کر بے زبانی کے مزے

گاہ حسرت و صوت کی سسکی سے بچنے کیلئے
پھول سے سر رکھ کے اکثر زانوئے پرشوق پر
جنبشِ مژگاں میں دل کی ترجمانی کے مزے
گلرخوں کی نیند کی، باتیں جوانی کے مزے

جلوۂ صہبا کی رنگینی بھری برساتیں
خاکِ راہِ دوست میں اکسیر کی سی شوخیاں
آگ کی موجِ رواں کے ساتھ پانی کے مزے
نقشِ پائے یار میں تاجِ کیانی کے مزے

پہلوئے جاناں کی تیز تر گرمیوں سے گاہ گاہ
لرزشِ صہبا میں لہجے کا ترنم تول کر
عمرِ فانی میں حیاتِ جاودانی کے مزے
پیشِ خوباں نطق کی گوہر فشانی کے مزے

بدگمانی کے محل پر حسنِ ظن کے ولولے
حسنِ ظن کے ولولوں میں بدگمانی کے مزے

التفاتِ یار کے دورِ طرب آہنگ میں
ہر قدم پر جوشِ مرگِ ناگہانی کے مزے

☆

جوانی

(۱۹۳۷ء)

کیا شرح کروں جوش جب آتی ہے جوانی　　سینے میں عجب دھوم مچاتی ہے جوانی
اک آگ سی پہلو میں لگاتی ہے جوانی　　اس آگ میں پھر دل کو تپاتی ہے جوانی
یوں خاک کو اکسیر بناتی ہے جوانی

اللہ رے جذبِ دلنشیں نرگسِ زیبا　　احساس میں آتا ہے وہ طوفان کہ توبہ
پہلو میں کچھ اس طرح مچلتی ہے تمنا　　آغوش میں بے جائے ہوئے بن نہیں پڑتا
اس طرح اشاروں سے بلاتی ہے جوانی

ہر روز رقیبات کے نظر آتے ہیں ساماں　　ہر صبح ستاتی ہے حدیثِ رخِ تاباں
ہر شام دکھاتی ہے خمِ کاکلِ پیچاں　　ہر رات کو، وا کرکے درِ خانۂ خوباں
پہلو میں حسینوں کے بٹھاتی ہے جوانی

ہر آنکھ میں پلکیں ہیں سنبھالے ہوئے بھالے　　اک کھیل ہے جو سامنے آئے وہ سنبھالے
ہر راہ میں معشوق ہیں گورے ہوں کہ کالے　　ہر گام پہ موجود ہیں دل چھیننے والے
ہر بام پہ سو طور دکھاتی ہے جوانی

ہر شے پہ عجب حسن ہے، کیا دل کو بچائیں
ہر ذرۂ عالم پہ برستی ہیں ادائیں
ہر سنگ سے اصنام کی آتی ہیں صدائیں
الفاظ ہی ملتے نہیں، کیا تجکو بتائیں
ہر چیز کو کیا کر کے دکھاتی ہے جوانی

اللہ رے خم کاکل و رنگ لب و رخسار
جو سامنے آیا، وہ ہوا دل سے خریدار
زنجیر ہیں گیسو کی، دو عالم ہے گرفتار
صوفی ہو کہ مے نوش، گدا ہو کہ زردار
دیکھو جسے، کھینچے لئے جاتی ہے جوانی

اوروں کا کوئی ناز لبھاتا ہی نہیں ہے
جز اپنے، کوئی دل میں سماتا ہی نہیں ہے
جلوہ ہو کوئی، رنگ جماتا ہی نہیں ہے
اپنا کوئی ثانی نظر آتا ہی نہیں ہے
اس ناز سے آئینہ دکھاتی ہے جوانی

خون ریز و دل آرام ہے کمبخت کی چتون
ظالم کی ہر اک آن ہے تمکین کی دشمن
ممکن نہیں جلنے سے بچائے کوئی دامن
ہم کیا ہیں رسول کے سلگ اٹھتے ہیں خرمن
بجلی وہ تبسم سے گراتی ہے جوانی

اللہ ری خواب آوریِ لحنِ خدا ساز
تاروں کا ذرا بچہ کوئی رہتا ہی نہیں باز
یکسوئی وہ ہوئی ہے کہ آتی ہے لبِ ساز
مژگانِ دو عالم کے جھپک جانے کی آواز
جب پچھلے پہر ساز اٹھاتی ہے جوانی

اللہ ری خوبانِ مجازی کی حکومت
معشوقِ حقیقی کو بھی ہو جاتی ہے حیرت
منھ ڈھانپنے لگتا ہے بہ افراطِ ندامت
پیرانِ کہن سال کا پندارِ عبادت
اصنام کے یوں نام اٹھاتی ہے جوانی

ذروں میں دمکتے ہیں درِ صاعقہ پرور — قطروں سے ابلتے ہیں شرابوں کے سمندر
خاشاک کے سینے میں جھلکتے ہیں گلِ تر — آئینوں کے اندر نظر آتا ہے سکندر
ہر بت کو خدا کر کے دکھاتی ہے جوانی

ہر خار میں اک پھول ہے ہر پھول میں رخسار — ہر برگ میں اک رنگ ہے ہر رنگ میں گلزار
ہر موج میں اک رقص ہے ہر رقص میں جھنکار — ہر شاخ میں اک لوچ ہے ہر لوچ میں تلوار
تصویر پہ تصویر بناتی ہے جوانی

کیا کفر کی قوت ہے کہ دب جاتا ہے ایمان — اسلام کے سینے میں لرز اٹھتا ہے قرآن
اڑ جاتے ہیں مسجد میں مؤذن کے بھی اوسان — گھبرا کے نکل آتے ہیں کعبے کے نگہبان
یوں دیر کی زنجیر ہلاتی ہے جوانی

جوانی کی رات

شب کہ حریمِ نازیں شورِ صد اضطراب تھا
عشق کبھی تھا برہنہ سر، حسن کبھی بے نقاب تھا

آنکھوں میں روئے یار تھا، آنکھیں تھیں روئے یار پر
ذرہ تھا آفتاب میں، ذرے میں آفتاب تھا

خشک تکلفات کی ٹوٹ چکی تھیں سب حدیں
چشمکِ بے دریغ تھی، خندۂ بے حجاب تھا

حسن کی بزمِ عشوہ میں شمعِ وفا تھی شوخ تر؟
عشق کی بارگاہ میں، زمزمہ باریاب تھا

سر پہ صراحیاں لئے رقص کناں تھے مغبچے!
نرگسِ نیم باز میں، رنگِ شرابِ ناب تھا

معرکۂ عظیم تھا ناز میں اور نیاز میں
زلف میں بھی تھی برہمی دل کو بھی پیچ و تاب تھا

موجِ ہوا میں عطر تھا، چھٹکی ہوئی تھی چاندنی!
پھول کھلے تھے صحنِ باغ میں، چرخ پہ ماہتاب تھا

عشق کی نبضِ تیز میں دوڑ رہی تھیں بجلیاں
حسن کے دستِ ناز میں شعلہ فشاں رباب تھا
پرتوِ یار اس طرف رامش و رنگ اس طرف
چشم کبھی فتح مند تھی، گوش کبھی کامیاب تھا
دردسے قلب چور تھے، کیف سے روح مست تھی
سوز کبھی بے نظیر تھا، ساز کبھی لاجواب تھا
ہونٹوں کو وقتِ گفتگو جو متنی تھی شگفتگی
بات جو تھی، سو پھول تھی، پھول جو تھا گلاب تھا
اور سحر کو، ہم نشیں! آنکھ کھلی تو کیا کہوں!
طاق میں شمع کشتہ تھی جیسے رخ پہ آفتاب تھا
تو بہ شکن گلابیاں، فرش پہ چور چور تھیں
خلد فروش جامِ زر، شرم سے آب آب تھا
نغمۂ رقص و بے خودی، جلوۂ حسن و شاعری
شب کو تھا بحرِ بیکراں، وقتِ سحر سراب تھا
بربط و چنگ کی صدا ایک فسردہ گونج تھی!
شمع و شراب کا سماں ایک پریدہ خواب تھا

لرزشِ بادہ وخمِ زلفِ سیاہ کے عوض
تھا تو چراغِ کشتہ کے دود کا پیچ و تاب تھا
گنبدِ قصرِ عیش میں گونج رہی یہ صدا!
رات نہ تھی وہ کیف کی، جوش ترا شباب تھا

(۱۹۲۳ء)

جوانی کے ساز و برگ

کچھ کسک سی دل میں کچھ آنکھوں میں آنسو آبدار — گاہ دردِ بےنوائی، گاہ کربِ انتظار
ہجر کی کچھ خشمگیں ناراضیوں کا پیچ و تاب — وصل کی کچھ دلنشیں راتوں کا نورِ ماہتاب
چند وقفے خوش دلی کے چند گھڑیاں جبر کی — کچھ تمنائیں شبِ مہتاب و روزِ ابر کی
کچھ لگاوٹ، کچھ ستم، کچھ نرمیاں، کچھ گرمیاں — گاہے ماہے چند راتیں مہوشوں کے زمزمیاں
کچھ دنوں تلخ و زبوں شامِ بلا کی تیرگی — کچھ شبوں میں پھول سے مکھڑوں کی میٹھی چاندنی
کچھ دنوں تک ظلمتِ ہول آفریں گرم عتاب — چند لمحے کچھ سنہری کنگنوں کی آب و تاب
کہ تمناؤں کے انگارے دلِ صد چاک میں — جستجو کی گہ خراشیں دیدۂ نمناک میں

چند سانسیں ہجر کی چلتی ہوئی تلوار پر
چند نیندیں روح فرسا کروٹوں کی دھار پر

کچھ فراغت کی امنگیں، کچھ مسرت کی نمو زانوؤں سے چند تکیے، کچھ تبسم کے سبو
دو گھڑی کے واسطے احباب سے راز و نیاز چند لمحوں کیلئے گل رنگ باہنوں کا گداز
چند لحظے بے دلی کے، چند وقفے طیش کے چند جھرنے سرخوشی کے، چند نغمے عیش کے
کچھ دنوں بھیگی ہوئی راتوں کا لطفِ بے قیاس شکریں باتوں کا رس، شاداب چہروں کی مٹھاس
کچھ تبسم، نرم کلیوں کی طرح کھلتے ہوئے چند چہرے چودھویں کے چاند سے ملتے ہوئے
ساعدوں کی چند شمعیں، عارضوں کے کچھ گلاب کچھ رخوں کی سرخیاں، کچھ مست آنکھوں کی شراب
کچھ خنک لہجوں کی شبنم، کچھ ترانوں کی پھوار کچھ لبوں کا شہد، کچھ زلفوں کا عطرِ مشکبار

لطف کے دو ایک دن تفریح کی ایک آدھ رات
اے جوانی! تھی تری لے دے کے اتنی کائنات

پھر بھی وہ تیز اسپک پروازِ عہدِ مختصر خندہ زن ہے آج تک عمرِ مسیح و خضر پر
دقت کی خوں ریزیوں پر بڑھ کے پانی پھیر دے
ان دنوں کی ایک ہی شب اے جوانی پھیر دے

(۱۹۲۹ء)

نظارۂ ماضی

دیوی ہے سحر کی جلوہ گستر
خاموش ندی پہ ہے دھواں سا
کیا مست ہوائیں آ رہی ہیں
پڑتا ہے اثر نہ جانے کیونکر
ظالم کی صدا سے دل کے اندر
کیا حال ہے جوش، دل ہواضی
احساس میں کیا رہے توازن
ہیں پیشِ نظر قدیم ہمراز
راتیں وہ خنک، وہ سرد صبحیں
رگ رگ میں بپا ہے اک تلاطم
آئینۂ شوخی و جوانی
جس کی آنکھیں تھیں دورِ ساغر
لب پر جو بنی ہوئی ہیں آہیں
تانیں یہ سرور کی سریلی

جھونکے ہیں نسیم کے مُعطّر
سبزے پہ ہے دھوپ کا گماں سا
"کو کو" کی صدائیں آ رہی ہیں
کوئل کی صدا کا حافظے پر
کھلتا ہے گزشتہ عہد کا در
پھرتا ہے نظر میں دورِ ماضی
سینے کی گرہ، صدا کا ناخن
"شکلوں" میں بدل رہی ہے "آواز"
بیدار ہوئی ہیں میرے دل میں
ہاں ہاں یہ انہیں کا ہے تبسم
تھا جس پہ مدارِ زندگانی
ہاں ہاں یہ وہی ہے ماہ پیکر
یہ تو ہیں اسی کی ترم یاہیں
لہجے میں جھجک یہ کمسنی کی

سامان تھے سب یہ اتفاقی — اب صرف "خیال" میں ہیں باقی
ان میں ہیں کچھ کہ سو رہے ہیں
کچھ "شعر" میں صرف ہو رہے ہیں

(۱۹۲۷ء)

☆

ایک قدیم سیر گاہ کو دیکھ کر

آ نکلے ہو تو، دم بھر ٹھہرو ذرا عزیزو — ہم اس زمین پہ کیا کیا فتنے جگا چکے ہیں
کیسی یہ جلد بازی، دم بھر تو سوچنے دو — یاں دامنوں کے کیا کیا پرزے اڑا چکے ہیں
ہاں یہ وہی ندی ہے جس میں نہا نہا کر — کتنے ہی ساونوں میں طوفاں اٹھا چکے ہیں
ساحل پہ کرم خوردہ یہ کشتیاں وہی ہیں — جن میں خم و سبو سے دریا بہا چکے ہیں
یہ سبزہ ہے جہاں ہم سوتے ہوئے منہ پر — صہبا چھڑک چھڑک کر اکثر جگا چکے ہیں
ہاں یہ وہی چمن ہے جس میں فروغ مے سے — کلیاں سی کمسنوں کے رخ پر کھلا چکے ہیں
دیکھو یہ سائباں ہے جس سائباں کے نیچے — کیا کیا جوانیوں کی عیدیں منا چکے ہیں
ہاں اس طرف یہ دیکھو رنگین وادیاں ہیں — ان وادیوں میں کیا کیا دھومیں مچا چکے ہیں

ہاں جوش یہ مناظر قائم رہیں ابد تک
اس رنگ و بو میں کیا کیا معشوق آ چکے ہیں

(۱۹۳۳ء)

مفلسوں کی عید

(۱۹۳۲ء)

اہلِ دُوَل میں دھوم تھی روزِ سعید کی
مفلس کے دل میں بھی نہ کرن تھی امید کی
اتنے میں اور چرخ نے مٹی پلید کی
بچے نے مسکرا کے خبر دی جو عید کی

فرطِ محن سے نبض کی رفتار رک گئی
ماں باپ کی نگاہ اٹھی اور جھک گئی

آنکھیں جھکیں کہ دستِ تہی پر نظر گئی
بچے کے ولولوں کی دلوں تک خبر گئی
زلفِ ثباتِ غم کی ہوا سے بکھر گئے
برچھی سی ایک دل سے جگر تک اتر گئی

دونوں ہجومِ غم سے ہم آغوش ہو گئے!
اک دوسرے کو دیکھ کے خاموش ہو گئے

مختار احمد خاں [۱]

(۱۹۲۲ء)

اے رفیقِ شفیق، اے مختار
میرے دیرینہ مونس و غمخوار

بذلہ سنج و ظریف و نکتہ شناس
خوش دل و خوش بیان و خوش گفتار

اے کہ سودائے عشق تیرا چلن
اے کہ ذوقِ نگاہ تیرا شعار

اے کہ سینے میں تیرے خوابیدہ
میرے طفلی کے ساز کی جھنکار

ہائے وہ سرزمینِ سیتاپور
ہائے وہ لکھنؤ کے   و نہار

ہائے وہ انجمن کی شامِ طرب
ہائے وہ گومتی کی صبحِ بہار

ہائے "لاٹوش روڈ" کے خم و پیچ
ہائے نخاس کے در و دیوار

ہائے بوڑھا سا وہ عزیز [۲] کا قد
ہائے کھلتا سا وہ رخِ دیدار [۳]

ہائے وہ "پار" [۴] کے رخ و کاکل
ہائے وہ چوک کے لب و رخسار

ہائے وہ سبزۂ امین آباد
ہائے وہ چار باغ کے انوار

ہائے وہ گل رخانِ کلکتہ
ہائے وہ مہ وشانِ "شالامار"

---

[۱] مختار احمد خاں احمد ملیح آبادی۔ [۲] عبد العزیز خاں ملیح آبادی جو بہ غایت پستہ قد واقع ہوئے ہیں [۳] دیدار حسن خاں ملیح آبادی [۴] لکھنؤ کا ایک محلہ جو گومتی کے اس پار واقع ہے۔

ہائے وہ بدمذاقیِ "مُلّا"[1] ہائے وہ کج ادائیِ اغیار
ہائے وہ شورشِ رفیع[2] و شرر[3] ہائے وہ بذلہ سنجیِ ابرار[4]
ہائے وہ سازِ شیر[5] و نذیر[6] ہائے وہ سوزِ عشق و موجِ ستار
ہائے روئے "شریف"[7] کی سرخی[8] ہائے نور الحسن کی شانِ وقار
وہ ظفر[9] کا خرام بے پروا وہ عطا[10] کی جبینِ صاعقہ بار
ہائے گم ہو گئے کدھر وہ دن! ہائے کیا ہو گئے وہ لیل و نہار

تو مورخ ہے عہدِ ماضی کا
عمرِ رفتہ کا تو فسانہ نگار
تجھ میں مضمر مری حکایتِ گل تجھ میں پنہاں مری حدیثِ بہار
"تو سلامت رہے ہزار برس!
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار"

---

۱ نام یاد نہیں۔ لاٹوش روڈ کی پشت پر رہتے تھے اور ہماری خوش مذاقیوں سے خوش رہا کرتے تھے ۲ رفیع احمد خاں ایم۔ اے سابق پروفیسر کیننگ کالج لکھنؤ ۳ احسن مرزا صاحب شعر لکھنا ہے ۴ ابرار حسن خاں اثر ملیح آبادی ۵ شاہزادہ مرزا جہانگیر نذیر بی۔ اے ڈپٹی کلکٹر۔ ۶ شیخ محمد نذیر صاحب جو کچھ دن ملیح آباد میں ہیڈ ماسٹر رہ چکے ہیں ۷ محمد شریف ایک دوست ۸ نور الحسن خاں ملیح آبادی ۹ ایک ہم مدرسہ دوست۔ ۱۰ عطا حسین لکھنوی خلف مرزا قاسم حسین ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس۔

مختار! واپس آ

(۱۹۲۵ء)

اے سمندر! اے شبِ مہتاب کے آئینہ دار
تیری چوپاٹی پہ ہر جنبش ہے پیغامِ بہار

سوئے مغرب تیرے سینے پر رواں ہے اک جہاز
عشق کی دنیا میں ہے جو کعبۂ سوز و گداز

آہ اس میں اک مسافر ہے شہیدِ آرزو
کشتۂ موجِ ہوائے گل، ہلاکِ رنگ و بو

اے سمندر! رہتی دنیا تک رہے تو شادکام
اس کو لہروں کی زبانی میرا پہونچا دے پیام

رو کے یہ کہنا کہ اے شاعر کے دیرینہ حبیب
اے بلاکش، اے وطن آوارہ، اے حرماں نصیب

اے زمانے کی ہزاروں سختیاں جھیلے ہوئے
اے مرے ہمراز، میرے ساتھ کے کھیلے ہوئے

بمبئی، تیری زیارت کے لئے آیا تھا میں
دل میں اک دنیا ہجومِ شوق کی لایا تھا میں

---

۱ مختار احمد خاں احمد ملیح آبادی

ابرِ غم میں چھپ گئی کشتی، لالِ عید کے
رہ گئی گھٹ کر مرے دل میں تمنا دید کی

کس طرف لے کر چلا ہے تجھکو قلبِ ناصبور؟
آہ اے چشم و چراغِ دودمانِ رامپور[1]

تو سوئے لندن رواں ہے بے ندیم و غمگسار
اور کن حالات میں، جن کا تصور ناگوار

رونے والے! وہ تری خلقی ظرافت کیا ہوئی
وہ ترے اجداد کی شانِ امارت کیا ہوئی

اب تک آویزاں ہیں وہ نقشے دلِ برباد میں
آہ جب رہتے تھے ہم دونوں ملیح آباد میں

لکھنؤ کی آج بھی وہ رنگ رلیاں دل میں ہیں
پہلے جو زیرِ قدم تھیں، اب وہ گلیاں دل میں ہیں

ہائے سیتاپور کی وہ روح پرور سرزمیں
ہائے خیر آباد کے وہ مہ وشانِ شرمگیں

وہ ہوائیں، وہ گھٹائیں، وہ فضا کچھ بھی نہیں
اب فقط اک داغِ ماضی کے سوا، کچھ بھی نہیں

---

[1] یہ معزز خاندان رامپور سے آکر ملیح آباد میں آباد ہوا تھا

اے مریضِ دردِ دل ، اے عاشقِ آشفتہ کار
آہ یہ صدمے ، تیری مجبوریوں کے ہیں نثار

اُف یہ کیسا پیچ ہے تقدیر کا ڈالا ہوا !
یوں نہ محنت کر، کہ تو نازوں کا ہے پالا ہوا

گوش بر آواز ہوں تیری صدا کے واسطے
جلد اے مختار واپس آ ، خدا کے واسطے

الوداع

(۱۹۲۴ء)

اے ملیح آباد کے رنگیں گلستاں الوداع
الوداع، اے سرزمینِ صبحِ خنداں الوداع
الوداع، اے کشورِ شعر و شبستاں الوداع
الوداع، اے جلوہ گاہِ حسنِ جاناں الوداع

تیرے گھر سے ایک زندہ لاش اٹھ جانے کو ہے
آ گلے مل لیں کہ آوازِ جرس آنے کو ہے؟

آ، کلیجے میں تجھے رکھ لوں مرے "قصرِ سحر"[۲]
اس کتابِ دل کے ہیں اوراق تیرے یاد پر
جا رہا ہوں، تجھ میں کیا کیا یادگاریں چھوڑ کر
آہ کتنے طور خوابیدہ ہیں تیرے بام پر

روح، ہر شب کو نکل کر میرے جسمِ زار سے
آ کے سر ٹکرائے گی تیرے در و دیوار سے

ہائے کیا کیا نعمتیں مجھ کو ملی تھیں بے بہا
یہ خموشی، یہ کھلے میدان، یہ ٹھنڈی ہوا
وائے یہ جاں بخش بستاں، ہائے یہ رنگیں فضا
مر کے بھی ان کو نہ بھولے گا دلِ درد آشنا

مست کوئل جب دکن کی وادیوں میں گائے گی
یہ سبک چھاؤں ببولوں کی بہت یاد آئے گی

---

۱ دکن جانے سے یہ نظم لکھی گئی تھی ۲ مصنف کے مکان کا نام

کل سے کون اس باغ کو رنگین بنانے آئیگا　　کون پھولوں کی ہنسی پر مسکرانے آئے گا
کون اس سبزے کو سوتے سے جگانے آئیگا　　کون ان پودوں کو سینے سے لگانے آئیگا
کون جاگے گا قمر کے ناز اٹھانے کے لئے
چاندنی راتوں کو زانو پر سلانے کے لئے

آم کے باغوں میں جب برسات ہوگی پرخروش　　میری فرقت میں لہو روئیگی چشمِ مے فروش
رس کی بوندیں جب اڑا دیں گی گلستانوں کے ہوش　　گنج رنگیں میں پکاریں گی ہوائیں "جوش جوش"
سن کے میرا نام موسم غمزدہ ہو جائے گا!
ایک محشر سا گلستاں میں بپا ہو جائیگا

صبح جب اس سمت آئیگی پراگندہ نقاب　　آہ کون اس دلکشا امید میں چھیڑیگا رباب
اس افق پر شب کو جب انگڑائی لیگا ماہتاب　　چاندنی کے فرش پر لہرائے گا کس کا شباب
جگمگائیگی چمن میں پنکھڑی کس کے لئے
رنگ برسائیگی ساون کی جھڑی کس کیلئے

گھر سے بے گھر کر رہی ہے آہ فکرِ روزگار　　سرنگوں ہے فرطِ غیرت سے ابِ جد کا وقار
خلعتِ ماضی ہے جسمِ زندگی پر تار تار　　پھر بھی آنکھوں میں ہے آبائی امارت کا خمار
شمع، خلوت میں ہے روشن، تیرگی محفل میں ہے
رُخ پہ گردِ بیکسی، شانِ ریاست دل میں ہے

کوچ کا پیغام لے کر آ گیا مہرِ منیر — گھر کا گھر ہے وقفِ ماتم، زرد ہیں برنا و پیر
رخصتِ بلبل سے نالاں ہیں چمن کے ہمصفیر — آ رہی ہے کان میں آوازِ گویا[۱] و بشیر[۲]
چھٹ رہا ہے ہات سے دامن ملیح آباد کا
رنگ فق ہے عزتِ دیرینۂ اجداد کا

کیا بتاؤں، دل نکلتا جاتا ہے میرا ہمنشیں — آئیں گے یاں خرمنِ اجداد کے جب خوشہ چیں
آ کے دروازے پہ جیسے ہی جھکا بیٹھیں گے جبیں — گھر کا سناٹا صدا دیگا: یہاں کوئی نہیں
جود و بخشش کا کلیجہ غرقِ خوں ہو جائے گا
میرے گھر کا پرچمِ زر سرنگوں ہو جائیگا

آہ اے دورِ فلک! تیرا نہیں کچھ اعتبار — مٹ کے رہتی ہے ترے جورِ خزاں سے ہر بہار
نوعِ انساں کو نہیں تیری ہوائیں سازگار — فکرِ دنیا، اور شاعر، تف ہے اے لیل و نہار
موجِ کوثر وقف ہو، اور تشنہ کامی کیلئے
خواجگی رختِ سفر باندھے غلامی کیلئے

آ گلے مل لیں، خدا حافظ گلستانِ وطن — اے "امانی گنج"[۳] کے میدان، اے جانِ وطن
الوداع اے لالہ زار و سنبلستانِ وطن — السلام اے صحبتِ رنگینِ یارانِ وطن
حشر تک رہتے نہ دنیا تم دکن کی خاک میں
دفن کرنا اپنے شاعر کو وطن کی خاک میں

---

۱ حسام الدولہ تہور جنگ نواب فقیر محمد خاں المتخلص بہ گویا ۲ نواب محمد بشیر احمد خاں بشیر رئیس اعظم ملیح آباد ۳ وہ میدان جہاں مصنف نے نظارۂ مناظر کی خاطر آبادی سے باہر مکان تعمیر کرایا تھا۔

غریب الوطن کا پیام

(۱۹۲۵ء)

اے چاند! جگمگا کر مکھڑا دکھانیوالے
غرفے سے آسماں کے اے مسکرانیوالے

عالم کی کیا حقیقت تیرے سفر کے آگے
اسوقت اک جہاں ہے تیری نظر کے آگے

جکڑا ہوا پڑا ہوں زنجیر سے دکن کی
سینے میں آرزو ہے بچھڑے ہوئے وطن کی

کس زندگی کی دھن میں ہمسایہ ہمنوا ہیں
جو ساتھ کھیلتے تھے وہ لوگ اب کہاں ہیں

شاداب تو ہیں میرے بچپن کی سیرگاہیں
اب ڈھونڈتی ہیں جن کو ترسی ہوئی نگاہیں

اچھی تو ہیں پڑوں کو دھن میں جھٹکنے والی
دیوار پر وہ آکر چڑیاں چہکنے والی

چھائی ہیں میرے دل پر کیوں بدلیاں محن کی
مجروح تو نہیں ہیں صبحیں مرے وطن کی

"میدان"۱؎ تو میرے غم میں کھویا ہوا نہیں ہے
"قصرِ سحر"۲؎ کا منہ تو اترا ہوا نہیں ہے

محفوظ تو ہیں اب تک طوفان کارواں سے
ترشی ہوئی وہ راہیں کھیتوں کے درمیاں سے

کیا اب بھی جھومتی ہیں کرتی ہوئی اشارے
نیلی سبک ہوائیں تالاب کے کنارے

بدلی ہیں گونجتے ہیں آموں کے باغ اب بھی
جلتے ہیں جنگلوں میں دھندلے چراغ اب بھی

۱؎ امانی گنج کا میدان جہاں مصنف نے نظارۂ قدرت کی خاطر مکان تعمیر کیا تھا

۲؎ مصنف کے مکام کا نام۔

اے چاندے تارے گردوں پہ جھلملائے
جب قدرتی مناظر صحرا میں مسکرائیں

تاروں کی کشمکش میں جب چاندنی ہو پھیکی
چادر سرک گئی ہو ماتھے سے جب کسی کی

بے داغ جب زمیں ہو اور آسماں کورا
جب سینۂ افق پر غلطاں ہو سرخ ڈورا

معصوم جھاڑیوں سے میرا سلام کہنا
آنکھوں میں اشک بھر کر پھر یہ پیام کہنا

کیوں میرا سوزِ فرقت تم کو جلا رہا ہے
کیوں مضطرب ہے! ٹھہرو، وہ دن بھی آ رہا ہے

جس دن دھڑکنے والے دل کو قرار ہوگا
سائے میں جب تمہارے میرا مزار ہوگا

☆

ٹھنڈی انگلیاں

(۱۹۲۵ء)

سرد انگلی اپنے مفلس باپ کی پکڑے ہوئے
رو رہا ہے ایک بچہ اک دکاں کے سامنے

اک کھلونے کی طرف انگلی اٹھا کر بار بار
کچھ نہیں کہتا ہے لیکن رو رہا ہے زار زار

باپ کی نمناک آنکھوں میں ہے تکمیل یاس
کیا قیامت ہے لبِ پسر کے آنسوؤں کا انعکاس

دل ہوا جاتا ہے بچے کے بلکنے سے فگار
کہہ رہا ہے زیر لب "فریاد اے پروردگار"

واہ کیا تقدیر ہے اس بندۂ معصوم کی
ہو چلی ہیں انگلیاں ٹھنڈی مرے معصوم کی

☆

یہ کھلونا

۱۹۲۵ء

یہ کھلونا ؟ نہیں مرے معصوم !
آگ اس کو سمجھ کے دور سے تاب
میرے ننھے سے ماہتاب ! نہ رو
آ ، سلا دے تھپک کے مفلس باپ

درد انگیز کھلونا

(۱۹۲۵ء)

ہاں یہی ہے وہ کھلونا اے دلِ آشفتہ حال
کھلتا پھرتا ہے جس سے ایک طفلِ خورد سال

ہاں یہی ہے وہ کھلونا، دیکھ چشمِ اشک بار
جس کی حسرت میں مرے بچے کا دل ہے بیقرار

اس کھلونے کی سبک گل کاریوں کے ذیل میں
ثبت ہیں اک تیرہ قسمت باپ کی محرومیاں

اس کا آب و رنگ ہے آئینۂ عبرت فزا
یہ مگر رنگ پریدہ ہے کسی مایوس کا

اس کے آئینوں میں ٹکڑے ہیں دلِ محروم کے
اس کی تابانی میں آنسو ہیں کسی معصوم کے

اس میں غلطاں ہے کسی بچے کا شوقِ مضمحل
اس کے سینے میں دھڑکتا ہے کوئی ننھا دل

کھیل دولت مند بچے! تو سدا پھولے پھلے
ہم ادھر ہنستے ہوئے آئے تھے اور روتے چلے

☆

انگیٹھی

(۱۹۲۸ء)

بچپن کی اے اداس انگیٹھی! خدا گواہ
کیا کہیے تجھ پر آج پڑی کس طرح نگاہ

تو اور خاک سر پہ یوں مثلِ سوگوار
افسوس اے زمانۂ طفلی کی یادگار

میری ہی طرح کیا ترا پہلو بھی سرد ہے
کیا تیرے آئینے پہ بھی ماضی کی گرد ہے

افسوس! وہ نشاط کے موسم، وہ زمزمے
جاڑوں کی دلفریب وہ راتیں وہ چہچہے

شعلوں سے تیز ہلتے وہ اٹھتا ہوا دھواں
وہ قہقہوں کی گونج وہ شیریں پہیلیاں

خوشبو وہ تیری آنچ کی، جاں بخش و دل نواز
وہ تیرگی میں رنگ ترا دل میں جیسے راز

شعلے وہ سرخ سرخ، دلوں میں تلے ہوئے
وہ سرخیوں میں نرم تبسم کھلے ہوئے

شعلوں کے بار بار وہ انداز دل نشیں
دم بھر میں زرنگار تو دم بھر میں سرمگیں

ڈوبی ہوئی حیات میں تیری وہ گرمیاں
وہ گرمیوں میں لطف کے تصور کی نرمیاں

وہ سادگی کی بزم میں بجتے ہوئے ستار
کلیوں کا کونپلوں کی چٹکنا وہ بار بار

وہ غنچگی کا عہد، وہ گل بار بار تری
اڑتی ہوئی ہوائیں وہ چنگاریاں تری

وہ نرم نرم جسم، وہ تیری حرارتیں
وہ ذمہ داریوں سے معرّا شرارتیں

وہ چھوکرے ادب سے دروں میں کھڑے ہوئے
دایائی کے سروں پہ وہ آنچل پڑے ہوئے

ماماؤں ماؤں کی صفوں میں وہ مغلانیوں کی شان
رکھا ہوا وہ تخت پہ چاندی کا پاندان

وہ نیرے گرد و پیش، بصد شانِ افتخار
آواز پاندان کے کھلنے کی بار بار

شایانِ آفریں وہ خواتین کا شعار
شوخی کے رنگ میں بھی وہ اک نوع کا وقار

وہ ہیکلیں گلوں میں، لبوں پر وہ لالیاں
ہلتی ہوئی وہ کانوں میں سونے کی بالیاں

وہ لونڈیوں کے رخ پہ نشاں خاک دھول کے
جوڑے وہ اونچے اونچے، وہ موہات تول کے

وہ مرد و زن لحافوں کے اندر گھسے ہوئے
رعب آفریں دروں میں وہ پردے چھٹے ہوئے

وہ نچلے بیٹھنے سے طبیعت کا انتشار
پہلو رضائیوں میں بدلنا وہ بار بار

ہلکی رضائیوں کی وہ افسانہ باریاں
اطلس کی سرخ گوٹ پہ وہ سرخ دھاریاں

وہ ایک بادشاہ کی بیٹی کا ذکرِ خیر
وہ ولولے جنوں کے وہ پریوں کا شوقِ سیر

وہ مرحمت میں غرق بڑی بوڑھیوں کی ذات
وہ کاٹنا ڈلی کا کہانی کے ساتھ ساتھ

وہ اک عجیب شانِ طرب سے ملی ہوئی
شیریں حکایتوں میں سروتوں کی راگنی

کیوں اب بھی یاد ہیں وہ لڑکپن کے زمزمے
اے شمعِ خوابگاہِ فراغت جواب دے

جن کو کھلا رہی ہیں ہماری جوانیاں
اب ان میں تجھکو یاد ہیں کتنی کہانیاں

اترے ہوئے چہرے

(۱۹۳۰ء)

آہ وہ لوگ کہ تھے میرے لڑکپن میں نظر بہت
جن کو ہنسنے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا

میرے آبا کی لگاتار نوازش کے طفیل
رنگ رلیوں میں ہی ہیں کٹتا تھا زمانہ جنکا

ان کے بعد اب ہیں کچھ اس درجہ ملول و غمناک
کہ انہیں دیکھ کے پھٹتا ہے کلیجہ میرا

میرا افلاس ملاتا نہیں اب ان سے نگاہ
میرے اجداد کی دولت کا تھا جن پر سایا

جس سے رہتی تھی شریفوں کے خط و خال میں آب
کیا ہوا، دورِ فلک! وہ مرے گھر کا نقشا

دیکھتی کاش جوانی بھی مری شاد انہیں
مست تھا جن کے لطیفوں سے لڑکپن میرا

دستِ خالی کی طرف دیکھ کے رہ جاتا ہوں
ان کا چہرہ نظر آتا ہے جب اترا اترا

آہ ان میں سے ہر اترا ہوا چہرہ اے جوش
مقبرہ ہے مرے اجداد کی فیاضی کا

فرطِ غم سے اسے تکتے نہیں پڑھنے کے لئے!
کتنی قبریں ہیں یہاں، فاتحہ پڑھنے کے لئے

☆

ماں جائے کی یاد

(۱۹۳۰ء)

میں دلی میں، تم وطن سے باہر — اے بھائی! بہن نثار تم پر
انگنائی میں ہو رہا ہے غوغا — ساون کی رُت ہو لیے پُروا
سائے میں گرجتی بدلیوں کے — استادہ ہیں دو شریر بچے
اک موجِ رواں ہے، اک چمن ہے — اک خیر سے بھائی، اک بہن ہے
کچھ دیر سے دونوں لڑ رہے ہیں — کیا جانئے کیوں جھگڑ رہے ہیں
میں دیکھ رہی ہوں اور چپ ہوں — کس جی سے بھلا فساد کاٹوں
اس جنگ کے آئینے کے اندر — بچپن ہے ہمارا جلوہ گستر

کرتے تھے شرارتیں، ادھم بھی
لڑتے تھے اسی طرح سے ہم بھی

بہن کی یاد

(۱۹۳۲ء)

کندہ ہے اس ظرفِ بشکستہ پہ یارب! کس کا نام
آہ، اب اس نام کا مفہوم ہے زیرِ مزار
دل پھٹا جاتا ہے میرا، آہ اے ظرفِ ملوّں
رکھ لوں دل میں اے میری بہن کی یادِ فکر
وہ بہن، شاداب تھے جس سے روایاتِ قدیم
وہ بہن، تابندہ تھا جس سے اب وجد کا وقار
اس کے حرفوں پر نظر پڑتے ہی اک مدت کے بعد
پھر گئی آنکھوں کے نیچے عہدِ طفلی کی بہار
دائم دل میں اس کے، ماضی کو مچلتا دیکھ کر!
ہو گیا کچھ اور بھی دکھتا ہوا دل بے قرار
خون رواے میری قبل از وقت پیری خول سے
اس کے نقطوں سے ہے بچپن کا تلاطم آشکار
گھر کی انگنائی میں گویا کھیلتا پھرتا ہوں میں
دل کو رہ رہ کر یہ دھوکا ہو رہا ہے بار بار

نیم میں جھولا پڑا ہے پک رہی ہیں پوریاں
پڑ رہی ہے ہلکی ہلکی مست بھادوں کی پھوار
پینگ لے لیکر مزے سے گا رہے ہیں باغ میں
"نیم کی نکولی پکی آئی ساون کی بہار
"میکے بنے آگیا جاگ جوگ ہے بیرن مرا"
رکھ دے اس طوفان میں نمو اسلئے ڈولی کہار
صحن میں پانی بھرا ہے۔ اور پائیں باغ سے
آ رہی ہے پارہ ماسے کی صدا دیوانہ وار
خود بخود بیٹے ہیں رہ رہ کر گھبرا آتا ہے دل
گو سمجھ میں کچھ نہیں آتی پپیہے کی پکار
چھوڑ دو عقلی کے طو! مجکو تنہا چھوڑ دو
صبر و تسکین کا ہوا جاتا ہے دامن تار تار
جیتے جیتے ہو چکے ہیں جوش کو چھبیس سال
ایک دل اور اتنے ماہ و سال کا ہم بول بار بار
داد دے معبود! اس دردِ نہاں کی دوا دے
یہ لطیفِ احساس، یہ طولِ حیاتِ مستعار
زندگی! اُف زندگی۔ سینے میں گھبراتا ہے دل
خانۂ جاں! توڑ دے اس قید خانے کا حصار

جب ستارہ ٹوٹ جاتا ہے۔ قسم اس وقت کی
تیرِ مرگِ ناگہاں کا تیر، ہیں تیرے نثار
رحم فرما، زہرِ ہستی اب پیا جاتا نہیں
اب ترے بندے سے اے مولیٰ! جیا جاتا نہیں

☆

خدا سے ایک سوال

(۱۹۲۲ء)

مادی عہد میں یہ ناداری
کون اپنی کرے گا غم خواری

کس طرف جائیں کس سے بات کریں
ہر طرف اک جمود ہے طاری

کس سے کہئے کہ اپنی صحت ہے
بدتر از صد ہزار بیماری

اہل افلاس غرقِ رشک و حسد
اہلِ دولت رہینِ غداری

اٹھ گیا ہائے دوستی کا چلن
لٹ گیا ہائے شہری دلداری

جس کے چہرے پہ فکر کے آثار
اسکی صورت سے سب کو بیزاری

مطمئن ہستیوں کا دنیا میں
مشغلہ ہے غریب آزاری

قدرداں کون ہے زمانے میں
علم و فن کی ہے سرد بازاری

افترا ہے وسیلۂ توقیر   راستی وجہِ ذلت و خواری
حجِ اکبر، طوافِ کیسۂ زر   حمد و تہلیل، حرفِ عیاری
جزوِ ایماں، مذاقِ بغض و نفاق   راہِ عرفاں، شعارِ مکاری
نظر آتی ہے اہلِ دانش میں   سیرتِ شاہدانِ بازاری
مایۂ صد نشاطِ روحانی   اہلِ دولت کی کفش برداری
اپنی تکمیل سے ہے شرمندہ   میری تخئیل کی فسوں کاری
بے خبر سو رہی ہے اک دنیا   منفعل ہے ہماری بیداری
فرقِ اغیار پر چمکتا ہے   ہند کا افسرِ جہانداری

اس تلاطم میں ہم ادیبوں کی
کیا ضرورت تھی ایزد باری

مُطالعہ و نظر

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بشمارِ دلبری
در دلِ سنگ بنگرد، رقصِ بتانِ آذری

(غالب)

گرہ یوں کھل رہی ہے ہر نفس ذوقِ نظارہ کی
کہ ہر ادنیٰ سی شے اب ایک عالم ہوتی جاتی ہے

(جوش)

حوض میں مستانہ بط کے تیرنے سے جس طرح
کائی میں پڑتا چلا جاتا ہے
حافظے پر یونہیں ایک بیدار کن گہری خراش
ڈال دیتی ہے شب غم میں پپیہے کی پکار

---

(۲)

مسکرایا خواب میں اس طرح اک طفل صبیح ؟
جس طرح صہبا کی لرزش سے دمک اٹھے ایاغ
اور اس تری سے، جیسے بتکدے کے طاق میں
جھٹپٹا ہوتے ہی روشن کر دیا جائے چراغ

---

(۳)

خاکِ گلشن پہ دھتر لکے کی لالہ کی ہیں
یوں ہیں پامال شگوفوں پہ نقوشِ بیداد
عید کے چاند پہ جس طرح نظر پڑتے ہی
دل میں معصوم یتیموں کے ہو، ماں باپ کی یاد

---

(۴)

رکھے ہوئے سونے کا طبق تازے سر پر — کہرے میں نظر آتی ہے یوں صبحِ درخشاں
ہو جاتی ہے جیسے طلوعِ انساں کی شرافت — ہنگامۂ افلاس میں کچھ اور نمایاں

---

(۵)

ساحلِ عثمان[1] ساگر کی چٹانوں پر سے موج
یوں گزر جاتی ہے اکثر برق کی رفتار سے
جیسے اٹھتی ہے دلِ مفلس میں موجِ انبساط
اور اٹھتے ہی گزر جاتی ہے قلبِ زار سے

---

(۶)

کثرتِ عصیاں کی گہری تیرگی میں گاہ گاہ
سامنے آتی ہے فکرِ عاقبت . یوں بے نیام
جیسے حملے کے لئے بیتاب بھوکے شیر کی
جھاڑیوں میں سے چمک اٹھتی ہیں آنکھیں وقتِ شام

---

(۷)

وداعِ طفلی و قربِ شباب کے باعث — تری "نگاہ" ہے بادہ "خیالِ" دل افروز
بدل رہا ہے جو پہلو ضمیرِ شاعر میں — اور آرہا ہے تار سے موزوں نہیں ہوا ہے ہنوز

---

[1] حیدرآباد کا ایک نظر فریب تالاب ۱۲

(۱۲)

وصل کی راتوں میں اب اس طرح سے آتا ہے یاد
ہجر کے عہدِ زبوں کا گریۂ صبح و مسا
جیسے اکثر نیند میں کروٹ بدلتے وقت جوش
کان میں آتی ہے ہلکی موجِ باراں کی صدا

---

(۱۳)

بوندیوں کا سلسلہ ہے اور ہلکے ابر سے
پڑ رہی ہیں اس طرح سبزے پہ کرنیں گاہ گاہ
وقتِ گریہ جس طرح مکتوبِ غم لکھتے ہوئے
آنسوؤں سے چھن کے آتی ہے سحر کاغذ نگاہ

---

(۱۴)

ایک ہلکی سی مسرت، ایک مبہم سی خوشی !
روح میں کچھ یوں مچلتی ہے بوقتِ پیچ و تاب
جیسے ہلکے ابر میں موہوم سا خطِ ہلال
یا کسی بیمار بچے کا تبسم وقتِ خواب

---

(۱۵)

کیا بتاؤں کہ وہ دمِ گلگشت
کس مزے سے قدم اٹھاتی ہے
جیسے کلیوں پہ رشحۂ شبنم
جیسے آنکھوں میں نیند آتی ہے

---

(۸)

رہروؤں کو دور سے پہچاننے کے واسطے ‏ سعی کی جاتی ہے یوں قندیلِ شبِ مہتاب میں
جس طرح انسان کی سیرت پرکھنے کے لئے ‏ ٹھوکریں کھاتی ہیں نظریں ظاہری آداب میں

---

(۹)

بتا چکتا ہے جب تو مشق، اک حلقہ سا تودے پر
نشانہ باندھ کر چٹکی میں اپنی، تیر لیتا ہے
چلانا چاہتا ہے یوں نہیں غم جس پر چھری اپنی
خوشی کا ہار پہلے اس گلے میں ڈال دیتا ہے

---

(۱۰)

اب کبھی فکروں سے اگر دم بھر کو پاتا ہوں نجات
ناتواں دل میں کھٹک جاتی ہے یوں یادِ بہار
صبح پچھلی نیند سے جس طرح چونک اٹھنے کے بعد
کمسنی کی بھول سی آنکھوں میں چبھتا ہے خمار

---

(۱۱)

چاند جب گردوں پہ آتا ہے بہ افگندہ نقاب ‏ دفعتہً کجلا سے جاتے ہیں ستاروں کے شرار
روبرو یوں ہی جب آ جاتا ہے وہ ماہِ تمام ‏ ماند پڑ جاتے ہیں آنکھوں میں سرشکِ انتظار

(۱۶)

صبح کے ہنگام جیسے مدرسے کی گھنٹیاں
طفل کے ذوقِ شکرخوابی کو کرتی ہیں نڈھال
یونہیں یہ تارے نواں بچوں کے مفلس باپ کی
نیند اڑا دیتا ہے اے خوابِ اجل تیرا خیال

---

(۱۷)

شاد و فرحاں ہیں نئے احباب تیرے لطف سے
سرد مہری سے قدیم احباب کا رُخ زرد ہے
یہ تری سیرت ہے ایسے تیز موٹر کی طرح
جس کے آگے روشنی ہے اور پیچھے گرد ہے

---

(۱۸)

شب کو اکثر کھلو کھلی تاریکیاں میدان کی
روح پر کرتی ہیں طاری اسطرح خوابِ گراں
دل سمجھتا ہے کہ مجھ پر غم سا ہے چھایا ہوا
جس طرح کہرے پہ ہو جاتا ہے بارش کا گماں

---

(۱۹)

پھاگنے ہی جیسے میلا چیتھڑا اڑتی ہے گرد
یونہیں، وہ دو شخص، جو اک دوسرے سے ہیں خفا
گفتگو کرتے ہیں جب آپس میں از راہِ نفاق
دیکھتا ہوں ان کے ہونٹوں سے غبار اڑتا ہوا

---

(۳۰)

جھٹپٹے کے وقت کوندے کا لپکنا بار بار — ظلمتوں پر مارتا ہے جس طرح تھم تھم کے تیر
یونہیں وحشت ناک عصیاں کی اندھیریوں میں — آدمی کے قلب کو رہ رہ کے ڈستا ہے ضمیر

(۳۱)

شب کو سوتے جنگلوں میں، جگنوؤں کے رقص سے
کانپ کانپ اٹھتی ہے کچھ یوں تیرگی بے اختیار
جس طرح مایوس راتوں کی فضائے تنگ میں
نیم جاں امید جھپکاتی ہے آنکھیں بار بار

(۳۲)

کیا کہوں، کس طرح آنکھیں کھولتی ہے نو عروس — منھ اندھیرے جیسے نرگس کی کلی بنتی ہے پھول
غنچۂ خاطر کی یا جس طرح کھلتی ہے گرہ — دل پہ یا جس طرح شعرِ کیف پرور کا نزول

---

(۳۳)

خشک ہو کر سایہ بخشی کی نہیں رہتی جب آس — حالتِ اشجار یوں اس وقت ہوتی ہے مقیم
جیسے آنکھوں میں گدا کی دیکھ کر عزمِ سوال — سر جھکا لیتا ہے فرطِ شرم سے مفلس کریم

(۳۴)

غبار اک دوسرے پر پھینکتے ہیں تیز رو موٹر — مخالف سمت سے ہمدوش ہو کر جب گزرتے ہیں
یونہیں دو گہرے اشخاص جب ملتے ہیں آپس میں — نئی تاریکیاں اک دوسرے سے اخذ کرتے ہیں

---

(۲۵)

دشت ہے تاریک اور رہ رہ کے کوندے کی لپک
چھو رہی ہے یوں افق کی ظلمتِ خاموش کو!
جیسے اس مایوس کی آنکھوں کا عالم جو غریب
حال کہنا چاہتا ہو اور کہہ سکتا نہ ہو

(۲۶)

تیرہ جنگل کی گھنی شاخوں کے گہرے سائے میں
بہہ رہی ہے جھٹپٹے کے وقت کچھ اس طرح نہر
جس طرح گیسوئے پیچاں کی درازی کا غرور
قامتِ خوباں میں بن جاتا ہے اک نازک سی لہر

(۲۷)

گندھے پھولوں میں چھپ جاتا ہے جیسے ہار کا ڈورا
یونہیں آنکھوں سے جب دل کی گھٹا برسائی جاتی ہے
تمام اپنی لطافت غرق کر دیتی ہے اشکوں میں
وہ موجِ کیف، سینے میں جو غم کے پائی جاتی ہے

(۲۸)

شبِ مہ میں جھلک کر سرمئی بادل کے ٹکڑوں سے
جمالِ ماہِ تاباں یوں کلی پر رقص کرتا ہے
ہجومِ ناز و فرطِ شرم کے طوفان میں جیسے
تبسم مد بھری آنکھوں سے ہونٹوں پر اترتا ہے

(۲۹)

کڑی دھوپ، آگ برساتی ہے جب گلزارِ عالم پر
تخیل ابر کا ہوتا ہے سبزے کے تغیر میں
یونہیں غموں ریز و خوں آشام تلوار و تکو ہستی کی
مرا دل تولتا ہے تیری رحمت کے تصور میں

---

(۳۰)

مل رہے ہیں دونوں وقت، اور گھر رہا ہے حوض میں
اک کھنک کے ساتھ، فوارے کا پانی اس طرح
خامشی سے چھیڑتی ہے، نرم دھیمی راگنی
شیب کی راتوں میں یادِ نوجوانی جس طرح

---

(۳۱)

شب کو اک پرسکون محفل کا — آکے موٹر مٹا گیا یوں ناز
جس طرح آئے، وقتِ بادہ کشی — کان میں مے فروش کی آواز

---

(۳۲)

جیسے موٹر کی گریزاں روشنی سے راہ میں — نصف لمحے کیلئے ظلمت پہ چھا جاتا ہے نور
سرمدا! آلام کے مارے ہوئے انساں کو — یونہیں چھو جاتی ہے دم بھر کیلئے موجِ سرور

(۳۳)

اس طرح تیرگی میں ہوتا ہے

خوف کا قلبِ طفل میں آغاز

جس طرح رات کی خموشی میں

سائیکل کی اُتار پر آواز

(۳۴)

وقتِ شب، کچھ اور بھی تاریک کر جاتا ہے یوں

اپنی چمکائی ہوئی ظلمت کو موٹر کا غبار

جس طرح کاندھے پہ رکھ کر بات دم بھر کو خوشی

دوش پر غم کا نیا اک اور رکھ جاتی ہے بار

(۳۵)

ہوا پر شور ہے، اور ابر بے موسم کی یورش ہے

لبِ ساحل شگفتہ چاندنی، مرجھائی جاتی ہے

یونہیں آزردہ انفاس آئینے کی سی حالت

عزیزوں کی شکر رنجی کی تہ میں پائی جاتی ہے

(۳۶)

نرم ہو جاتا ہے ململ سے جو پک کر پھوڑا

بہتر نشترِ جراح سے ہوتا ہے فگار

نرشِ گل کی بو نہیں ہوجاتی ہے جو گرم جو نرم

ہوتا پڑتا ہے اسے خارِ خیلال سے دوچار

(۳۷)

پیشِ اربابِ نظر مشکور ہو سکتی نہیں — یہ تری اظہارِ بے مہری کی سعیِ متصل
یوں تغافل ہیں ترے غلطاں بہ موجِ التفات — پردۂ اشعار میں جس طرح شاعر کا دل

(۳۸)

رات ہے اور چاند حجرے کے — سرخ شیشوں سے آ رہا ہے نظر
قطرۂ گریہ سے چشمِ عاشق میں — جیسے روئے نگار، وقتِ سفر

(۳۹)

شام ہونے ہی یہ کیسا ہو گیا ہے آسماں — حاشیے پر روشنی ہے وسط میں تاریکیاں
کیوں نڈر ہو کر نہ میں کہدوں کہ یہ طرزِ سماں — ہو بہو ایسا ہے جیسے عمرِ حاضر کے جواں

(۴۰)

صبح طالع ہو رہی ہے اور فضائے سرد میں
کھا رہا ہے پیچ و خم تاریک کہرے کا دھواں
ادھر کی مخلوق، یوں گلیوں میں آتی ہے نظر
خواب میں جس طرح سے دیکھے کوئی پرچھائیاں

(۴۱)

ایک دلکش صبیح چہرے پر — صبح کی ہیں علامتیں طاری
جیسے نمکیں چیز میں اے جوش — ایک ہلکی، مٹھاس کی دھاری

(۴۲)

باغ پر ہیں جھکے ہوئے بادل
بو ہے جھونکوں میں نرم پانی کی
کنج پر چھائی ہے وہ کیفیت
نیند جس طرح نوجوانی کی

(۴۳)

تلملاتی مچھلیوں کی شوخیوں سے جس طرح
سطح پر تالاب کی، پڑتے ہیں حلقے بار بار
یوں نہیں دل کی لرزشِ پیہم کے ہاتھوں ہر نفس
میری چشمِ تر میں رہتی ہے تمنا بیقرار

(۴۴)

بھولی بھٹکی ہوئی جنگل میں پرندے کی صدا
کوئی آوارہ سا جھاڑی میں ہوا کا جھونکا!
لُو کے طوفان میں تپتے ہوئے ذروں کی لپک
کرب کے ساتھ کڑی دھوپ میں پودوں کی لچک
غنچۂ زرد کا پامال عقیق و یاقوت
گھانس پر دھوپ کی ماری ہوئی تتلی کا سکوت
کُرۂ نار سے چیلوں کی لرزتی آواز
بوکھلاتے ہوئے کبوتروں کی پریشاں پرواز
سرخ ذرات پہ کھائے ہوئے مٹنے کی قسم
رہروِ تشنہ کے مرجھائے ہوئے نقشِ قدم

یوں ہے ان سب میں نہاں حسرتِ بارانِ سحاب
آئے پردیس میں، جس طرح سے یادِ احباب

☆

(۴۵)

جس طرح گنجان باغوں کی ہوا وقتِ غروب
شام کے انفاس سے بنتی ہے آہِ سوگوار
کنج سے آتی ہے اک مرطوب بوجھل سی شمیم
منجمد سی بھاپ ہوتی ہے کنارِ جوئبار!
سینۂ جنگل پہ ہوتا ہے حرارت کا دباؤ
حسرتِ شبنم میں خون روتی ہے چشمِ برگ و بار
یونہیں ہو جاتے ہیں کچھ دن انہیں دیکھے ہوئے
روح ہو جاتی ہے بوجھل، اور سینہ تنگ و تار
اٹھنے لگتی ہے برابر ہر بنِ مو سے اک آنچ
جس سے آتی ہے تمنا کی شمیمِ سوگوار
اور کچھ آنکھوں میں یوں آنسو مچلتے ہیں ندیم
ماہِ تاباں کا ستارۂ دل کو ہو جیسے انتظار

☆

(۴۶)

پھول مٹھی میں اگر کچھ دیر تک رہتے ہیں بند
ہاتھ میں ہوتی ہے پیدا اک معطر سی نمی
یونہیں جب کچھ دیر کرتا ہوں تصورِ حسن کا
سانس میں ہوتی ہے خوشبو اور آنکھوں میں نمی
اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ جاناں نے مجھے
بھینچ کر آغوش میں تا دیر چھوڑا ہے ابھی

(۴۷)

سنایا مجھے ایک مطرب نے آج
وہ نغمہ کہ تھا دل میں سویا ہوا
جوانی کی راتوں میں یادش بخیر
جسے چھیڑتا تھا کوئی مہ لقا
کچھ اس طرح نغمے کا ہر زیر و بم
مری سمت آنکھیں اٹھانے لگا
کسی اجنبی شہر میں جس طرح
کوئی بھولا بچھڑا ہوا آشنا
سرِ راہ لوگوں کے انبوہ سے
بڑھے یک بیک مسکراتا ہوا

(۴۸)

شام کا وقت گاؤں کا میدان
سادہ رخ، سرد، سرنگوں انسان
سلسلے کوہسار کے دور
سامنے صرف اک غنودہ کھجور
جیسے اک تشنۂ جواب "سوال"
جیسے غربت میں دوستوں کا خیال

(۴۹)

سر سے نزدیک ہو کے اک طائر / یوں اڑا صبح، نیند جیسے آئے
نصف لمحے کے واسطے مجھ کو / گیت اس طرح شہپر نے سنائے
ذہن سے جس طرح کہ بات کوئی / یاد آتے ہی محو ہو جائے

(۵۰)

جس طرح اے حسنِ خود بیں نبضِ کاہ و روحِ کوہ
روز و شب اک لرزشِ پیہم سے رہتے ہیں دوچار
کاہ کے دل میں مچلتا ہے لپکِ رنگ و بو
تابشِ خورشید، موجِ باد و باراں کا شرار
کوہ میں فرطِ خوشی سے ناتراشیدہ صنم!
ڈھونڈتے ہیں بت تراشوں کی نظر دیوانہ وار
یونہیں میرے مضمحل جوہر، مرے افسردہ عزم
تیرے ہلکے سے تبسم کے لئے ہیں بے قرار

☆

تسبیب[1]

حسن جنبید ز خواب و مژہ برہم زد
فتنہ برپا شد و نشتر بہ رگِ عالم زد

(انظیوریؔ)

[1] "تسبیب" عربی میں اس شاعری کو کہتے ہیں جس میں حسن و عشق کا ذکر ہو۔

عاشق نواز

(۱۹۲۳ء)

میری پرستش اور تیری بزمِ ناز
آفریں اے شاہدِ عاشق نواز

میں سراپا خاک اور میرے لئے
سلسلہ جنبانیِ راز و نیاز

اک مرے دل کی تسلی کے لئے
زلزلے میں آئے اورنگِ ناز

تیری طبعِ ناز اور آشفتگی
تیرا پہلو، اور خراشِ جانگداز

یہ تیرا رخ اور رنگِ خستگی
یہ ترے لب اور حدیثِ سوز و ساز

تیرا سینہ، اور میری آرزو
میری محفل، اور تیری شمعِ ناز

تیرا دل، اور کاوشِ سوزِ نہاں
تیرا ساز، اور ترا نوئے سوز و گداز

آہِ سوزاں، اور ترے لعلِ لب
اشکِ خونیں، اور تیری چشمِ ناز

خارِ حسرت، اور ترا قلبِ رقیق
گردِ حرماں، اور تری زلفِ دراز

تیرا دامن اور وقفِ اشکِ غم
تیرا سینہ، اور بارِ حرفِ راز

آہ وہ اعدا اس طرح جھک کے ملے
خود اٹھاتی ہو جوانی جس کے ناز

جس کے قدموں پر ہو خود فطرت کا سر
وہ پڑھے اور مجھ سے ملنے کو نماز

اس کے دل سے پوچھئے غم کا مزا
"دل شکن" جس کیلئے ہو "دل نواز"

مفت دو جانیں تلف ہونیکو ہیں — سن رہا ہے اے خدائے بے نیاز
مہرباں ہوائے انیس بیکساں — رحم فرما اے کریم کارساز
ابر میں ہے سنگباری کی گرج
آئینوں کو دیکھ لے آئینہ ساز

چاند کے انتظار میں تارے

(١٩٢٣ء)

کس نے وعدہ کیا ہے آنے کا / حسن دیکھو غریب خانے کا
روح کو آئینہ دکھاتے ہیں / در و دیوار مسکراتے ہیں
آج گھر "گھر" بنا ہے پہلی بار / دل میں ہے خوش سلیقگی بیدار
غرق ہے روح خوش جمالی میں / نظم ہے طبعِ لا اُبالی میں
جمع ساماں ہے عیش و عشرت کا / خوف دل میں فریبِ قسمت کا
سوزِ قلبِ کلیم آنکھوں میں / اشکِ امید و بیم آنکھوں میں

چشم بر راہ، شوق کے مارے
چاند کے انتظار میں تارے

رات بھیگی، شگفتہ ہار ہوا / رنگ کلیوں میں آشکار ہوا
ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں مچلی / ہلکی ہلکی مہک چنبیلی کی
وعدہ جنجال بن گیا جی کا / رنگِ امید ہو چلا پھیکا
اک جہاں چشمِ تر میں گرد ہوا / دل وو دھڑکا کہ رنگ زرد ہوا

دفعتہً اک چمک سی دوڑ گئی
بام و در پہ جھلک سی دوڑ گئی

دل میں چمکی امید کی بجلی — انگلیاں اور ہو گئیں ٹھنڈی
الاماں شوقِ دید کی یورش — بڑھ گئی دورِ خون کی گردش

اپنی حدِ وفا ہوئی محسوس
ان کی آوازِ پا ہوئی محسوس

چھا گئی بام و در پہ رعنائی — دل میں لی ولولوں نے انگڑائی
جل اٹھی شمع دل کی محفل میں — صبح گویا ہوئی بنارس میں
فرطِ شادی سے جی کھلا سا گیا — دل میں احساس، شادمانی کا
تار نظروں کے دمبدم کانپے — لڑکھڑائی زباں، قدم کانپے
نہ رہا سلسلہ وہ آہوں کا! — رشتہ سمٹا مری نگاہوں کا

آئے وہ اشک تھم گئے بارے
چاند نکلا سبک ہوئے تارے

☆

جفائے وفا

(۱۹۲۳ء)

دل کی بستی میں کیوں نہ ہو کہرام
کاش اسی وقت مجھکو موت آجائے
کاش وہ یوں نہ باوفا ہوتی
اے وفا کیا کہوں میں تیرے طور
تیرا خنجر بھی نہیں سکتا
جھینپتی ہے جفا ترے آگے
بول اے نامہ بر جیوں کیسے

آہ یہ نامہ۔ ہائے یہ پیغام
آگ ہیں پھول کس سے دیکھا جائے
یا نہ ظلم ناروا ہوتی
تو ہے اک بدترین آلۂ جور
ہل کے پانی بھی پی نہیں سکتا!
کانپتی ہے قضا ترے آگے
پھر تو دہرا، یہ کیا کہا اس نے

"آنکھ کھلتے ہی، صبح تیری یاد!
دل پہ کرتی ہے جانے کیا بیداد
دل مرا غرقِ یاس رہتا ہے
شام تک بھی اداس رہتا ہے"

پھول

(۱۹۲۳ء)

یہ کس نے جوش کو بھیجے ہیں نازپرور پھول
شگفتہ پھول، جواں پھول، خلد پیکر پھول

ہوائے ناز سے چٹکے ہوئے سبک غنچے
شمیمِ زلف سے مہکے ہوئے معطّر پھول

شعاعِ حسن سے دہکے ہوئے خنک شعلے
لبِ نگار کے چومے ہوئے سخنور پھول

نسیمِ کاکلِ شب گوں سے پرفشاں گلبرگ
فروغِ نرگسِ شیریں سے خواب آور پھول

ارم سے آئی ہوئی حسرتِ آرزو کلیاں
خدائے ناز کے بھیجے ہوئے پیمبر پھول

پلٹ کے اے خلشِ نوکِ خار کے شاکی
اسے بھی دیکھ، جسے ڈس رہے ہیں کافر پھول

اِسے کیا کہتے ہیں

(۱۹۲۳ء)

جب ادا سے وہ سامنے آئی ؛
ہمنشیں ! میں اسے نہ دیکھ سکا !
اور جب آنکھوں سے ہوگئی اوجھل
میں نے جی بھر کے اس کو دیکھ لیا

کچھ کہا اس نے اور میں سن نہ سکا
اور جب وہ چلی گئی کہہ کے
میرے کانوں نے سن لیا وہ بھی !
جو کہا بھی نہ تھا ہنوز اس نے

تجاہلِ عارفانہ

(۱۹۲۳ء)

کیوں صبح یوں عرق میں نہائے ہوئے ہو تم
شاید کسی خلش کے جگائے ہوئے ہو تم

الجھا ہوا ہے کرب سے ہر رشتۂ نفس
گو دیکھنے میں زلف بنائے ہوئے ہو تم

جن مشغلوں سے کھیلتی رہتی تھی کم سنی
ان مشغلوں سے ہاتھ اٹھائے ہوئے ہو تم

شاید یہ اہتمام ہو اخفائے راز کا
ہمجولیوں سے آنکھ چرائے ہوئے ہو تم

خود کو لئے دیتے ہو مگر کہہ رہے ہیں طور
سینے میں ایک حشر چھپائے ہوئے ہو تم

کیا جوشؔ نامراد کو دیکھا ہے خواب میں
یوں صبح کو جو شام بنائے ہوئے ہو تم

پہلی مفارقت

(١٩٢٣ء)

چاند سے عہدِ وصل کی باتیں
ہائے فرقت کی چاندنی راتیں

آفتیں جمع کی ہیں جدائی کی
چاندنی رات ہے جدائی کی

کوئی کافر ہی شب کو سوتا ہے
رات بھر دل میں درد ہوتا ہے

اٹھتی رہتی ہیں بار بار آنکھیں
ڈھونڈتی ہیں جمالِ یار آنکھیں

کچھ وہ تکیوں سے آتی ہے خوشبو
نیند آتی نہیں کسی پہلو

چھیڑتا ہے جو کوئی رات کو ساز
صاف آتی ہے یار کی آواز

آگ سی پہلوؤں میں جلتی ہے
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جو چلتی ہے

مُرغ جب صبح کو جگاتے ہیں
چونکتے ہی وہ یاد آتے ہیں

شغلِ مرگ و حیات کی راتیں
ہائے وہ التفات کی راتیں

بے نتیجہ ہے صبر کی تلقین
بلکہ دیتا ہے جب کوئی تسکین

شعلۂ غم بھڑکنے لگتا ہے
اور بھی دل دھڑکنے لگتا ہے

بر نفس آہ، ہر سخن نالہ
سم ہے آب و ہوائے بنگالہ[1]

[1] یہ نظم کلکتے میں کہی گئی تھی۔

اے اودھ کی نسیم عقدہ کشا — وہ ملیں تو پیام یہ کہنا
بادلوں کی طرح برستی ہیں — آنکھیں دیدار کو ترستی ہیں

اٹھتی رہتی ہے ہوک سی پیہم — ہائے وہ رخ، وہ کاکل برہم
ہائے وہ چاندنی، وہ مہتابی — مست آنکھوں کی وہ شکر خوابی

برگ گل پر وہ ماہتاب کی ضو — رخ پہ وہ آمدِ شباب کی رو
خال و خد سے عیاں بصد انوار — صبح صادق کی چاندنی کا نکھار

ہاں تو اے دلنشیں اودھ کی صبا — وہ ملیں تو پیام یہ کہنا
بادلوں کی طرح برستی ہیں — آنکھیں دیدار کو ترستی ہیں

ایک مدت ہوئی تمہیں دیکھا — ہائے تیرا وہ چاند سا مکھڑا
اس طرح صبح و شام ہوتی ہے — دل دھڑکتا ہے آنکھ روتی ہے

کھائے جاتا ہے کوئی سینے کو — آگ لگ جائے ایسے جینے کو
تنگ ہے سانس آنے جانے سے
اب بلا لے کسی بہانے سے

زرد کلیاں

(۱۹۲۳ء)

بھیجی ہیں کسی نے بہرِ درماں
بیلے کی چمن فروز کلیاں

ڈوبی ہوئی عطرِ کم سنی میں
دونے کی مہین کوری سینکیں

کلیوں سے مگر عیاں ہے زردی
یہ روحِ غم ان میں کس نے بھر دی

گویا ہیں زبانِ حال سے یوں
اے شاعرِ خوش نصیب و محزوں

بھیجا ہے چھپا کے ہم کو جس نے
جانے اسے غم دیئے ہیں کس نے

یوں زرد وہ روئے دل نشیں ہے
اک چھینٹ بھی خون کی نہیں ہے

ہم سے یہ کہا ہے جا کے کہنا
لازم نہیں اب خموش رہنا

مجھکو تری یاد نے ڈبویا
مرجھائی ہوئی کلی ہوں گویا

بھرتی ہوں چھپا کے شب کو آہیں
ہٹتی نہیں چاند سے نگاہیں

شاما جو سحر کو بولتی ہے
آنکھوں کی گرہ کو کھولتی ہے

لب خشک ہیں منہ ہے اترا اترا
پنڈا کب سے ہے پھیکا پھیکا

چہرے سے عیاں ہے دل کی الجھنیں
ڈھیلے ہیں کلائیوں کے کنگن

اللہ یہ کیا ہوا ہے مجھکو   دیکھو جسے دیکھتا ہے مجھکو
اب حد سے سوا ہے خستہ حالی   نزدیک ہے وقت پائمالی
آنا ہو تو آ کہ دل ہے بیتاب   ایسے میں ابھی چمن ہے شاداب

جلد آ کہ فروغِ رنگ و بو ہو
قبل اس کے کہ فوتِ آرزو ہو

عقدۂ لاینحل

(۱۹۲۴ء)

(۱)

درسِ عبرت ہے یا اولی الابصار — میرا افسانۂ دلِ بیمار
یہ فسانہ نہیں حقیقت ہے — "شاعری سے نہیں مجھے سروکار"
دل میں ہیں جذبہائے گوناگوں — الجھی جاتی ہے کاکلِ گفتار
کم پڑی ہوگی نوعِ انساں پر — جس مصیبت سے آج میں ہوں دوچار

(۲)

اس طرف حسن، خود سر و خود بیں — اس طرف عشق، ضابط و خوددار
اس طرف نازِ دلبری کا شکوہ — اس طرف شعر و بیخودی کا وقار
اس طرف حسن غرقِ صد نخوت — اس طرف عشق، محوِ صد پندار
اس طرف شوخیوں میں بھی تمکین — اس طرف اضطراب میں بھی قرار
اس طرف بے رخی ہے درماں سے — اس طرف ہے پرستشِ آزار
اس طرف چارہ گر ہے بے پروا — اس طرف بے تیا رہے بیمار
اس طرف اعتبارِ عشوہ و ناز — اس طرف اعتمادِ صبر و قرار

اس طرف کیفِ نرگسِ مخمور ! اس طرف دورِ بادۂ اشعار
اس طرف عہد ہے نہ سننے کا اس طرف بند ہیں لبِ گفتار
کہنے جاؤں تو وہ سنیں روداد سننے آئیں تو میں کروں اظہار
مجھکو یہ کد، وہ ہوں تبسم ریز ان کو یہ ضد کہ یہ کرے اصرار

(۳)

یہ روش ترک بھی اگر کر دوں ایک عُقدہ ہے اور بھی دشوار
فرض کیجئے اسے بھی سلجھا دوں گتھیاں اور بھی تو ہیں دو چار
مدّعا ہے فرض وہ پیچیدہ کہ دعا مانگنا بھی ہے دشوار

(۴)

مجھکو وصل و فراق دونوں مس مجھکو تریاق و زہر دونوں دار
عہدِ اخلاص توڑنے میں بھی ننگ رشتۂ شوق جوڑنے میں بھی عار
ان کا آنا، بلائے ہوش و خرد ان کا جانا، وداعِ صبر و قرار !
ان سے ملئے تو عاقبت برباد ! ان سے کھنچیے تو زندگی بیکار !
ان کی وابستگی بھی سوزِ جحیم ان کی بیگانگی بھی شعلۂ ناز
ان کا پردہ بھی موجبِ ایذا ان کا جلوہ بھی باعثِ آزار
ان کی دوری بھی خنجرِ خوں ریز ان کی قربت بھی دشنۂ خونخوار
ان کے کھونے پہ بھی نہیں راضی ان کے پانے پہ بھی نہیں تیار

کون سمجھے گا ان معموں کو
عشق ہی مست عشق ہی ہشیار
عشق ہی ہجر کے لئے بیچین
عشق ہی وصل کے لئے بیمار
عشق ہی قدر دانِ جلوۂ نور
عشق ہی مدح خوانِ گوشۂ تار
عشق ہی راہِ سعی میں خفتہ
عشق ہی بزمِ فکر میں بیدار
کس قدر ہیں عمیق یہ باتیں
کس قدر ہے عجیب یہ گفتار
کون سمجھے گا ان معموں کو
دور ہیں آہ محرمِ اسرار

(۵)

اس طرف تو یہ کشمکش دل میں
اور ادھر ہے یہ رنگ لیل و نہار
ایک طرف زاہدوں کی مجلس میں
میری غیبت کا گرم ہے بازار
اک طرف عاقلوں کی محفل سے
سخنِ ناروا کی ہے بوچھار
قابلِ مضحکہ مرے انداز
درخورِ سرزنش مرے اطوار
گوش، پامالِ طعنۂ احباب
چشم، مجروحِ خندۂ اغیار
راہزن جمع، راہبر ناپید
رات تاریک، راہ ناہموار
آنکھ نمناک، راستے خس پوش
نور خوابیدہ ظلمتیں بیدار
جلوے معدوم، زمزمے مفقود
چشم خوں نابہ ریز، گوش فگار
وضعِ اہلِ وطن، معاذاللہ
تہمتوں کے لگا دیئے انبار
غربت افسردگی، وطن کلفت
غیر بے حس عزیز ناہنجار

کس سے جا کر کہے کوئی احوال — کس سے جا کر کرے کوئی اظہار

اہلِ ظاہر مجھے خس و خاشاک — اہلِ باطن، مجھے در دیوار

بند ہے مجھ پہ فیض دیر و حرم — تنگ ہیں مجھ سے کافر و دیندار

سخت ہیں مجھ پر کفر کے آئین — تیز ہے مجھ پر شرع کی تلوار

اک طرف موت، ایک جانب زیست — وہ بہت سہل، یہ بہت دشوار

ہر سخن آگ، ہر نفس بجلی

"وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّارِ"

نگارِ رفتہ

(۱۹۲۴ء)

نگارِ رفتہ کو یارب! وطن میں پہنچا دے
دوبارہ ذرّہ عدن کو عدن میں پہنچا دے
حرم کی شمع کو طاقِ حرم میں روشن کر
چمن کی جان کو صحنِ چمن میں پہنچا دے
وطن کی روح کو جسمِ وطن میں واپس کر
غزالِ دشتِ ختن کو ختن میں پہنچا دے
سمن سے پھر سمنستاں کو شادماں فرما
گہر کو پھر صدفِ پُر محن میں پہنچا دے
صبا کو گل کدۂ آرزو میں رقصاں کر
صنم کو بت کدۂ برہمن میں پہنچا دے
وہ اپنے حسن سے محفل ہیں اپنے عشق سے بزم
اس انجمن کو پھر اس انجمن میں پہنچا دے
سکوتِ جوشؔ کو دے رخصتِ ترانۂ شکر
سخن کو حلقۂ شاہِ سخن میں پہنچا دے

عشقِ کامراں

(۱۹۲۴ء)

تعالی اللہ کی وہ دلدارِ شیریں
ہوا ہے پھر انیسِ جانِ غمگیں

مبارک اے دلِ حیراں مبارک
کہ پھر جاری ہوئے آئینِ پیشیں

ترانے چھیڑ اے بلبل طرب کے
کہ زیرِ سنگ ہے دامانِ گلچیں

خوشا طالع کہ میرے بازوؤں پر
مچلتی ہے وہ زلفِ عطر آگیں

حدیثِ لطف سے گرما رہے ہیں
مرے سینے کو وہ لبہائے رنگیں

بحمد اللہ وہ خود مائل ہوا ہے
برغمِ بندگانِ رسم و آئیں

محبت کامران و شادماں ہے
بھلا دو قصۂ فرہاد و شیریں

شادی و مرگ

(۱۹۲۴ء)

کدھر ہے اے موت! آ، کہ غم سے لبوں پر اب جان آ رہی ہے
وہ شمع، جو یادگارِ شب تھی، اسے بھی آندھی بجھا رہی ہے
دُہائی حسنِ خجستہ خو کی، کہ رسمِ عالم کی فتنہ خیزی
بچھڑے ہوؤں کو ملا رہی ہے، ملے ہوؤں کو چھڑا رہی ہے
اُدھر نفیری کی مست لہریں لئے ہوئے ہیں پیامِ شادی
اُدھر نسیمِ سحر گی جنبش ترانۂ غم سنا رہی ہے؟
اُدھر عروسی لباسِ زر میں دمک رہا ہے کسی کا مکھڑا
اِدھر کسی کی خوشی کو دنیا سیاہ کفنی پنہا رہی ہے
ندیم پیغامبر تھی میری، صبا کو یہ آج کیا ہوا ہے
اِدھر بجھاتی چلی ہے شمعیں، اُدھر شگوفے کھلا رہی ہے
اِدھر کلیجے میں تھرتھراتا ہے شعلۂ مرگِ ناگہانی
اُدھر شبستانِ رنگ و بو میں حیات نو مسکرا رہی ہے
اِدھر عرق ہے مری جبیں پر، اُدھر جھلکتی ہے جوشِ افشاں
اِدھر لبوں پر ہیں سرد آہیں، اُدھر صبا گنگنا رہی ہے

تیرے لئے

(۱۹۲۵ء)

دیکھ کیوں کر جی رہا ہوں دل ربا تیرے لئے
ہر نفس ہے اک حدیثِ کربلا تیرے لئے

ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں اپنے کو تیری راہ میں
پوچھتا پھرتا ہوں میں اپنا پتا تیرے لئے

میں کہ آغوشِ سکوں میں پا چلا تھا آپ کو
پھر محیطِ کشمکش میں کھو گیا تیرے لئے

حسرتیں دل کی رواں ہیں کارواں در کارواں
ہر نفس ہے ہجر میں بانگِ درا تیرے لئے

آہ گو اک عمر سے ہوں میں رئیس ابن رئیس
بن کے نکلا ہوں گدائے بے نوا تیرے لئے

مانگتا ہوں بھیک درویشوں سے تیرے قرب کی
شاہ کے کوچے میں دیتا ہوں صدا تیرے لئے

شرع سے درخواست کرتا ہوں کشودِ کار کی
کھٹکھٹاتا ہوں درِ دارالقضا تیرے لئے

آہ اک فتوے کی خاطر کہنا پڑتا ہے مجھے!
"شیخ" سے نااہل کو "مردِ خدا" تیرے لئے
جاہلانِ بے خرد کے ناسزا اقوال کو
ماننا پڑتا ہے بے چون وچرا تیرے لئے
چاک کر کے ہیں نے آبائی امارت کا لباس
زیب تن کی ہے غلامی کی قبا تیرے لئے
مشتری جس کا خدا تھا، چند سکوں کے عوض
بیچ دی ہیں نے وہ جنسِ بے بہا تیرے لئے
پھیر لیں آنکھیں مناظر سے ملیح آباد کے
لکھنؤ کی چھوڑ دی آب و ہوا تیرے لئے
کر چکا ہوں شدتِ حرماں سے تنگ آکر معاف
ہر فرو مایہ کو اپنا خوں بہا تیرے لئے
پوجنا پڑتا ہے ہر کافر کو تیرے واسطے
ماننا پڑتا ہے ہر بُت کو خدا تیرے لئے
آہ جو فرشِ حرم پر بھی کبھی جھکتا نہ تھا
میں نے بت خانے میں وہ سر رکھ دیا تیرے لئے
شرط پوری ہو چکی، اللہ اب تو رحم کر
دیکھ کیا تھا جوش، اور کیا ہو گیا تیرے لئے

☆

خواب کی پرچھائیں

(۱۹۲۵ء)

سناٹا پچھلی رات کا ہے، مخلوقِ خدا کی خواب میں ہے
تاروں کی نگاہیں نیچی ہیں۔ ہلکی سی چمک مہتاب میں ہے
اطراف میں روشندانوں کے کچھ نور سا دھیما دھیما ہے
دیواروں کے نیچے گلیوں میں پر یوں اندھیرا چھایا ہے
پتوں کو سمیٹے خواب میں ہیں ڈری ہوئی بیلیں کانٹوں پر
بول اٹھتا ہے بے ہنگام کبھی اک آدھ پرندہ شاخوں پر
اللہ یہ کیسی بے چینی اس وقت دلِ بیتاب میں ہے!
یہ عکس ہے کس کا ذروں پر کس کی یہ جھلک مہتاب میں ہے
فردوس کی شمعیں روشن ہیں، یا عکس چراغِ طور ہے
گھر بھر میں یہ کس کا پرتو ہے، ہر چیز پہ کیسا نور ہے
حلقے میں گھرا ہوں جلووں کے ہستی کا نہیں کچھ ہوش مجھے
اس وقت یقیناً خواب میں کوئی دیکھ رہا ہے خوش مجھے

غربت میں ہے شانِ صبحِ وطن، ہر چیز پہ وہ رعنائی ہے!
پردیس میں اپنے مجنوں کی تسکین کو لیلیٰ آئی ہے

طوفان سا جوئے شیریں میں ہے، حسن آیا ہے کشتی کھینے کی
بیتاب ہے شیریں، بازوِ فرہاد کے بوسے دینے کو

اک رنگ سا مجھ پہ رقصاں ہے، اک نور سا دل پر چھایا ہے
ان ہونٹوں پہ شاید سوتے میں ہلکا سا تبسم آیا ہے

☆

جفائے التفات

(۱۹۲۵ء)

کیا وہ بنائے کیا کیا عشوہ روزگار نے
مارا ہو جس غریب کو حسن وفا شعار نے

اب وہ شہیدِ التفات دل کی گرہ کسے دکھائے
بند کیا درِ طرب جس پہ کشود کار نے

سمجھے گا کون نکتہ رس اسکی خدا بشانِ خونچکاں
جس کا لہو بہا دیا تیغِ وفائے یار نے

کون یقین لائے گا کس سے کہوں یہ ماجرا
لوٹ لیا امرانجمن عربدۂ بہار نے

مصحفِ انبساط نے آیۂ حزن پیش کی
فتح سے دور کر دیا نصرتِ کردگار نے

مجھکو ذرِ نشاط نے اشکِ الم عطا کئے
شامِ شکستِ تندر کی صبحِ ظفر شکار نے

حسن کے جذبِ عشق نے دل کو تباہ کر دیا
پھول کی روح کھینچ لی شبنمِ اشکبار نے

پھبتیں ہیں آکے عشق کے جوش تجھے مٹاؤنگا
مجھ سے قسم یہ کھائی تھی حسنِ ستم شعار نے

آرزوئے محروم

(۱۹۳۶ء)

فریاد ہے اے خلوتیِ پردۂ ناموس
کب سے ہوں تری دھن میں گریباں دریدہ

واقف ہے کہ کس طرح سرِ بالش و بستر
راتوں کو تڑپتا ہے ترا زلف گزیدہ؟

دم بھر کے لیے تو کبھی آغوش میں آ جا
اے عمرِ رواں! سایۂ آہوئے رمیدہ

ممکن ہو تو اب خاکِ ذلت سے اٹھا لے
میں کب سے پڑا ہوں صفتِ اشکِ چکیدہ

وہ سجدہ کروں، سر ہی نہیں روح بھی جھک جائے
دے اذن اگر جنبشِ ابروئے خمیدہ

قسمت کی طرح دستِ طلب بھی تو ہے کوتاہ
افسوس ہے اے میوۂ شاداب و رسیدہ

وحشی کا کسی رُت میں بھی جی خوش نہیں ہوتا
فریاد ہے اے افسرِ گلہائے دمیدہ

سونے کو ترستی ہیں برستی ہوئی آنکھیں
بیدار ہو اے ترکِ محبت بخشیدہ

ظالم! ترے دیوانہ، محروم کے سر پر
ہر آن حریفوں کی کمانیں ہیں کشیدہ

آتا ہوں ترے شہر میں پامالِ ملامت
جاتا ہوں تری راہ سے دشنام شنیدہ

"در کوئے تو معروفم و از روئے تو محروم
گرگِ دہن آلودہ و یوسف ندریدہ" (سعدی)

ناقابلِ تسخیر

(۱۹۲۶ء)

ہمنشیں! اترکِ وفا پر اسے توبیخ نہ کر
قید ہوتی ہے کہیں بوئے چمن، موجِ گہر؟
جلوۂ شبنم و نورِ سحر و بانگِ طیور
ان کی تسخیر کا دنیا میں ہے کس کو مقدور

ہمنشیں! اترکِ وفا پر اسے توبیخ نہ کر
وہ کبھی تھی بوئے چمن، خندہ گل موجِ گہر

بس گئے خاک میں سو میرا
ہمنشیں! اس کے لئے تنگ تھا پہلو میرا
پوچ اس دل کو مرے جس نے اسے رام کیا
اس نے دو دن بھی جو چاہا تو بڑا کام کیا

کون لے گیا

(۱۹۲۶ء)

اے یارِ دلنشیں! وہ ادا کون لے گیا!
تیرے نگیں سے نقشِ وفا کون لے گیا

حل کر دیا تھا جس نے معما شباب کا
تجھ سے وہ فکرِ عقدہ کشا کون لے گیا

تھا لطف پہلے قہر، بس اب صرف قہر ہے
ظلمت سے موجِ آبِ بقا کون لے گیا

کیوں دفعتہً لبوں پہ خموشی سی چھا گئی
اس سازِ دلنشیں کی صدا کون لے گیا

آنکھوں سے شانِ بذل و سخا کس نے چھین لی
سینے سے ذوقِ لطف و عطا کون لے گیا

تھیں جس کی رو سے خونِ تمنا میں سرخیاں
رخسار سے وہ رنگِ وفا کون لے گیا

راتوں کو مانگتا تھا دعا میری دید کی
وہ نیتیں، وہ ذوقِ دعا کون لے گیا

اے شاہِ بندہ پرور و سلطانِ نرم دل
دل سے ترے خیالِ گدا کون لے گیا

پہلی سی وہ کلام میں نرمی نہیں رہی
گفتار سے مزاجِ صبا کون لے گیا

اب جوش کے لئے ہیں نہ آنسو، نہ آہِ سرد
اس گلستاں کی آب و ہوا کون لے گیا!

آتے نہیں ہو تم

(۱۹۲۶ء)

محرابِ جاں میں شمع جلاتے نہیں ہو تم
اب مسکرا کے سامنے آتے نہیں ہو تم

ظاہر میں تو حجاب ہو، در پردہ سامنا
پردا اب اس ادا سے گراتے نہیں ہو تم

پہلے مری نظر تھی اور ارزانیٔ جمال
اب خواب میں بھی شکل دکھاتے نہیں ہو تم

جس کا ہر ایک حرف تھا اک دفترِ نشاط
وہ بات اب زبان پہ لاتے نہیں ہو تم

آنکھوں میں اشک رخ پہ تمنا لبوں پہ آہ
اب اس ادا سے سامنے آتے نہیں ہو تم

میرے پیامبر کے اٹھاتے تھے پہلے ناز
اب میرے دل کے ناز اٹھاتے نہیں ہو تم

آتی ہیں حسبِ قاعدہ راتیں اسی طرح
لیکن نظر بچا کے اب آتے نہیں ہو تم

یک لخت تم نے جوش کو دل سے بھلا دیا
اور اس میں بھید کیا ہے! بتاتے نہیں ہو تم

آن باقی ہے

(۱۹۳۶ء)

ہنوز عشق و محبت کی شان باقی ہے
وہی زمیں، وہی آسمان باقی ہے

جبیں پہ گو، شکنِ عقل ہے زمانے سے
مگر نظر میں جنون کا نشان باقی ہے

ربابِ فصلِ بہاری خموش ہے کب سے
ہنوز مطربِ وحشت کی تان باقی ہے

وہ ان جفا ہی جفا رہ گئی ہے مدت سے
یہاں جفا پہ وفا کا گمان باقی ہے

جفا کا اب نہیں اگلا سا بانکپن قائم
مگر وفا کی وہی آن بان باقی ہے

وہ جوش، چھوڑ چکے ناوک افگنی پھر بھی
چمکتا تیر، لچکتی کمان باقی ہے

اداس صبح

(۱۹۳۶ء)

خواب میں دیکھ کر رخِ زیبا — آنکھ میری کھلی تو کیا دیکھا
گھر ہے تاریک، تنگ، سرد، خموش — دل دھڑکتا ہوا، اڑے ہوئے ہوش
نبض سی فرش کی ہر ایک شکن — لب پہ خشکی، دماغ میں الجھن
لے رہی ہے عجب طرح لہریں — ایک نرم آنچ سی کلیجے میں

ہل گیا دل، کلیجہ یوں دھڑکا
اسی ہلچل میں ہو گیا تڑکا

مرغ بولے فضا پہ چھلکا نور — صحنِ گلشن میں چہچہائے طیور

یوں صدائیں ہواؤں پر کھیلیں
میں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں

خبر ہے کہ نہیں

(۱۹۲۶ء)

اے صبا! کوچۂ جاناں میں گزر ہے کہ نہیں
تجھکو اس فتنۂ عالم کی خبر ہے کہ نہیں

بجھ گیا مہر کا فانوس کہ روشن ہے ابھی
اب ان آنکھوں میں لگاوٹ کا اثر ہے کہ نہیں

اب مرے نام کا پڑھتا ہے وظیفہ کوئی
اب مرا ذکرِ وفا وردِ سحر ہے کہ نہیں

اب بھی تکتی ہیں مری راہ وہ کافر آنکھیں
اب بھی ذرِ دیدہ نظر جانبِ در ہے کہ نہیں

چھپ کے راتوں کو مری یاد میں رونا ہے کوئی
موجزن آنکھ میں اب خونِ جگر ہے کہ نہیں

حسن کو پرسشِ بیمار کا ہے اب بھی خیال
مہر کی ذرۂ خاکی پہ نظر ہے کہ نہیں

بے خبر مجھکو زمانے سے کیا ہے جس نے
کچھ اسے میری تباہی کی خبر ہے کہ نہیں

کھائے جاتا ہے مجھے دردِ غریب الوطنی
دل پر اس جانِ وطن کے بھی اثر ہے کہ نہیں

جوشؔ خاموش بھی ہو پوچھ رہا ہے کیا کیا
کچھ تجھے تاڑنے والوں کی خبر ہے کہ نہیں

☆

تیرا عہدِ تمنّا

(۱۹۲۷ء)

دل نے بخشا تھا تقاضائے زلیخا تجھکو — یاد ہے وہ خلشِ عہد تمنا تجھکو
چونکتے ہی ترے دل سے وہ دھواں اٹھتا تھا — شبِ تاریک تھا ہر نور کا تڑکا تجھکو
نرگسِ ناز میں یوں اشک بھرے رہتے تھے — نظر آتا تھا ورقِ دہر کا دھندلا تجھکو
الاماں عشق میں الجھی ہوئی نیچی نظریں — دل سا ملتا تھا ہر اک شے میں دھڑکتا تجھکو
روزِ باراں میں ستاتا تھا غمِ عشق مجھے — شبِ مہتاب میں ڈستی تھی تمنا تجھکو
ہر گھڑی میری حضوری کی تمنا تھی تجھے — ہر نفس میری جدائی کا تھا دھڑکا تجھکو
ہائے کیا دن تھے کہ آئینے کے آگے ہر صبح — چاند سا منہ نظر آتا تھا جب تیرا تجھکو
حضرتِ خضر جہاں راہ بھٹک جاتے ہیں — عشق نے لاکے وہاں چھوڑ دیا تھا تجھکو

جب ہوا، ابر کے سائے میں سنک جاتی تھی
چھیڑ دینا تھا محبت کا تقاضا تجھکو

چاندنی صحن میں جس وقت چھٹک جاتی تھی
پھونک دیتا تھا مرے عشق کا شعلا تجھکو

راستے سے کوئی آواز جب آ جاتی تھی
میری آواز کا ہو جانا تھا دھوکا تجھکو

قہر ڈھاتا تھا مرا درسِ تحمل تجھ پر
زہر لگتا تھا مرا وعدۂ فردا تجھکو

کیا قیامت تھی کہ اس گل بدنی کے باوصف
روز کانٹوں پہ لٹاتی تھی تمنا تجھکو

میں کسی بات پہ دم بھر کے لئے غور کروں
اتنی فرصت کبھی نہ ہوتی تھی گوارا تجھکو

جوش سے پوچھ کہ اب تک ہے اسے یاد وہ دور
کہ کبھی مہر و وفا کا بھی تھا دعوے تجھکو!

التجائے کرم

(۱۹۲۸ء)

آ ناز سے پھر، اورانیس دل و جاں ہو
اے خونِ طرب! عشق کی نبضوں میں رواں ہو

اللہ ری ظلمت کہ سجھائی نہیں دیتا
اے شمع! خدا کے لئے پھر شعلہ فشاں ہو

اے ماہِ شبِ چار وہم، پھول کھلا دے
اے موجِ نسیمِ سحری! عطر فشاں ہو

مرجھا کے نہ رہ جائے کہیں کشتِ تمنا
اے ابر! مچل، اے رخِ خورشید نہاں ہو

راتیں مجھے کانٹوں پہ بدلواتی ہیں پہلو
اے صبح! علم کھول دے، اے نور عیاں ہو

اے صبح! کبھی رات کے پہلو میں بھی آجا
اے شاہ! گدا کا بھی کبھی مونسِ جاں ہو

اے بادہ! کبھی جامِ سفالیں میں بھی کر ناز
اے عرش کبھی فرش پہ بھی نور فشاں ہو

اے دیدۂ مے پرورِ واے نرگسِ مخمور!
دم بھر کے لئے میری طرف بھی نگراں ہو
اے غنچہ لبی! حروف و حکایت کے کھلا پھول
اے کم سخنی! چشمۂ تقریر و بیاں ہو
اکسا دے چراغ آ کے مرے خانۂ دل کا
قبل اس کے کہ شعلے کی جگہ صرف دھواں ہو
تو ہاتھ جو آجائے تو پھر جوشؔ کے نزدیک
اک جو کے برابر بھی نہ جنسِ دو جہاں ہو

دو خواب

(۱۹۲۹ء)

شب کہ واں سازِ طرب آسودۂ مضراب تھا
گوشۂ خلوت مرا اک دیدۂ پر آب تھا
کنجِ تنہائی میں تھا یاں صرف اک ناکام دل
مسندِ شادی پہ واں انبوہِ شیخ و شاب تھا
یاں اسیرِ یاس پر چھائی ہوئی تھی مُردنی
واں عروسِ نو کا چہرہ غرقِ آب و تاب تھا
خاک پر یاں سر تھا، اور آنکھوں میں اشکِ لالہ رنگ
فرش پر واں پھول تھے، اور چرخ پر مہتاب تھا
یاں بساطِ تشنگی پر تھیں بلا کی کروٹیں
واں حریمِ عیش میں دورِ شرابِ ناب تھا
تھی ادھر تقدیر سے یادِ مُراد و موجِ بزم
اس طرف ٹوٹی ہوئی کشتی تھی اور سیلاب تھا
ان کی چشمِ ناز میں تھا واں شکرخوابی کا رنگ
میری آنکھوں کو ادھر فرمانِ ترکِ خواب تھا

آرہا تھا موج در موج اس طرف ابرِ بہار
بحرِ غم میں اس طرف گرداب پر گرداب تھا
نامرادی کا تصور بھی نہ تھا واں باریاب
کامرانی کا تخیل بھی یہاں نایاب تھا
ناگہاں آلام کی شدت سے چکرانے لگا
سر، کہ خلدِ زانوئے جاناں سے لذت یاب تھا
کس سے کہئے التفاتِ یار کی دریادلی
ذرہ ذرہ بوستانِ شوق کا شاداب تھا
قصۂ رنگین عہدِ سجدہ ریزی کیا کہوں
سامنے ان ابروؤں کا گوشۂ محراب تھا
عشق بازی کا غرورِ کامرانی، الاماں
میری حسرت میں خود اس کا حسن جب بیتاب تھا
کاوشِ ذوقِ نظر بازی کی رنگینی ہائے ہائے
دیدۂ مخمور جب میرے لئے بے خواب تھا
لعلِ گوہر بیز کی ہر آہ تھی موجِ نسیم
نرگسِ رنگیں کا ہر آنسو دُرِ خوش آب تھا
اور اب یہ بیدلی ہے انقلابِ دہر سے
جیسے بحرِ لطف ازل کے دن ہی سے پایاب تھا

تھا یہی عالم کہ آئی بامِ گردوں سے صدا
یہ بھی اک دن خواب ہو جائے گا، وہ بھی خواب تھا

یہ بھی نہ سہی

(۱۹۲۹ء)

تیرے قربان ارے خواب میں آنے والے
داستاں عہدِ تمنا کی سنانے والے

ہاں ترے حرفِ شکایت سے پشیمان ہیں ہم
بخش دے بہرِ خدا، جرم کہ انسان ہیں ہم

یہ مگر وہم ہے اے پیکرِ حسن تنویر
کہ یہ دل اب ہے کسی اور کی زلفوں کا اسیر

ہاں ترے ہجر میں اک شغل نکالا ہے ضرور
شدتِ کاہشِ آلام کو ٹالا ہے ضرور

قاعدہ ہے نہیں ہوتا ہے فلک پہ جب ماہ
لطف اٹھاتی ہے چمکتے ہوئے تاروں سے نگاہ

بن ترے جب کسی کل چین نہیں پاتا ہوں
میں کبھی یوں ہی دلِ افسردہ کو بہلاتا ہوں

تو ہے آزردہ، تو جھوٹی ہی تسلی نہ سہی
رشک آتا ہے اگر تجھکو تو یہ بھی نہ سہی

التجائے مرگ

(۱۹۲۹ء)

کر قطعِ نخلِ عمر، گلستاں کا واسطہ
یارب، بہارِ عالمِ امکاں کا واسطہ

اے نشۂ حیات دے بے ہوش کو فراغ
تجھکو خمارِ نرگسِ جاناں کا واسطہ

اے آفتابِ عمر کو دے رخصتِ غروب
تجھکو طلوعِ صبحِ بہاراں کا واسطہ

کام و دہن کو موت کی تلخی سے کر دوچار
شکر فشانیٔ لبِ خوباں کا واسطہ

اب طولِ زندگی سے مجھے کر نہ شرمسار
بالیدگیٔ زلفِ پریشاں کا واسطہ

ساقی پلا اجل کی ابلتی ہوئی شراب
عمرِ مسیح و چشمۂ حیواں کا واسطہ

کسی کی نصیبِ دشمناں خطرناک ناسازیٔ مزاج کے موقع پر یہ نظم کہی گئی تھی

اے چشمِ تر سے چھین بھی لے نورِ زندگی
اہلِ نظر کے دیدۂ حیراں کا واسطہ

آنسو مری حیات کا ٹپکا دے خاک پر
یا رب، نزولِ قطرۂ نیساں کا واسطہ

دے روزِ تلخ زیست کو اب حکمِ اختصار
تجھکو درازیٔ شبِ ہجراں کا واسطہ

زہِ قامتِ حیات پہ کر اب کمانِ مرگ
تجھکو سہی قدانِ گلستاں کا واسطہ

جھلکا مری جبیں پہ عرق کربِ نزع کا
رنگیں رخوں کی تابشِ افشاں کا واسطہ

اے حکمِ زندگی سے فراغت کی دے نوید
شیریں لبوں کی سستیٔ پیماں کا واسطہ

اب جلد چاک کر مرے رختِ حیات کو
چاکِ قمیصِ یوسفِ کنعاں کا واسطہ

چٹکی سے چھوڑ ناوکِ ہستی شکار کو
مست انکھڑیوں کی جنبشِ مژگاں کا واسطہ

احساں نہ کیجیے

(۱۹۲۹ء)

برباد پھر بزرگیٔ قرآں نہ کیجیے
اب زحمتِ اعادۂ پیماں نہ کیجیے

اب خانۂ امید میں ظلمت ہی نور ہے
تکلیفِ اہتمامِ چراغاں نہ کیجیے

دیکھے ہوئے ہوں کتنے بہار و خزاں کے رنگ
اب خارزارِ دل کو گلستاں نہ کیجیے

چھایا ہوا ہے مطلعِ امید پر غبار
اب رخ پہ کاکلوں کو پریشاں نہ کیجیے

انجامِ عذر خواہیٔ بخشش کا واسطہ
اب اعترافِ جورِ فراواں نہ کیجیے

اب خطِ شوق کھینچیے بے رنگ ہی مجھے
افشاں کو صرفِ زینتِ عنواں نہ کیجیے!

اب دل کو بزمِ ناز کی حسرت نہیں رہی
اب عذرِ بدمزاجیٔ درباں نہ کیجیے!

سلجھا چکا ہوں عقدۂ آسودگیٔ موت
اب ذکرِ خضر و چشمۂ حیواں نہ کیجیے

اب خنجرِ فراق کو رکھیے نہ میان میں
اب توسنِ وصال کو جولاں نہ کیجیے

اقرار اولیں کا جنازہ ہے دوش پر
اب تازہ رسمِ کہنۂ پیماں نہ کیجیے

جس دل پہ ناز تھا وہی باقی نہیں رہا
اب زندگی سے مجھکو پشیماں نہ کیجیے

دم ہی نہیں ہے جوشش میں تجدید شوق کا
احسان اب یہی ہے کہ احساں نہ کیجیے

گھٹا چھائی تو کیا

(۱۹۳۵ء)

چھٹ گئے جب آپ ہی، اُودی گھٹا چھائی تو کیا
تُربتِ پامال کے سبزے پہ لہر آئی تو کیا

جب ضرورت ہی رہی باقی نہ لحن و رنگ کی
کوئلیں کوکیں تو کیا، ساون کی رُت آئی تو کیا

ہجر کے آلام سے جب چھٹ چکی نبضِ نشاط
اب ہوا نے خار و خس میں رُوح دوڑائی تو کیا

ہو چکی ذوقِ تبسم ہی سے جب بیگانگی
اب چمن افروز پھولوں کو ہنسی آئی تو کیا

مڑ چکی جب موت کے جادے کی جانب زندگی
اب کسی نے عافیت کی راہ دکھلائی تو کیا

ہر نفس کے ساتھ دل سے جب دھواں اٹھنے لگا
بادلوں سے چھن کے اب ٹھنڈی ہوا آئی تو کیا

سامنے جب آپ کے گیسو کی لہر ہی نہیں
بدلیوں نے چرخ پر اب زلف بکھرائی تو کیا

ہو چکا پایاب جب بحرِ سرورِ برگِ شباب

اب سمندر کی جوانی یاد پر آئی تو کیا!

غنچۂ عہدِ طرب ہی مل چکا جب خاک میں

خاکِ گلشن اب گل تر بن کے اترائی تو کیا

مٹ چکے جب والہانہ بانکپن کے ولولے

آئی اب دوشیزۂ موسم کو انگڑائی تو کیا

کھل چکا جب پرچمِ عَلَم زندگی کے قصر پر

اب ہواؤں سے کم پودوں کی لچکائی تو کیا

آنسوؤں میں بہ گئیں جب خون کی جولانیاں

جنگلوں کی چھاؤں میں برسات اٹھلائی تو کیا

جوش کے پہلو میں جب تم ہی مچل سکتے نہیں

پھر گھٹا کے دامنوں میں برق لہرائی تو کیا

☆

اب کیا کروں

(۱۹۳۵ء)

چھا گئی برسات کی پہلی گھٹا اب کیا کروں
خوف تھا جس کا وہ آپہنچی بلا اب کیا کروں
ہجر کو بہلا چلی تھی گرم موسم کی سموم
ناگہاں چلنے لگی ٹھنڈی ہوا اب کیا کروں
آنکھ اٹھی ہی تھی کہ ابر لالہ گوں کی چھاؤں میں
درد سے کہنے لگا کچھ چٹپٹا، اب کیا کروں!
اشک ابھی تھمنے نہ پائے تھے کہ بیدردی کے ساتھ
بوندیوں سے بوستاں بجنے لگا اب کیا کروں
زخم ابھی بھرنے نہ پائے تھے کہ بادل چرخ پر
آ گیا انگڑائیاں لیتا ہوا، اب کیا کروں
آچلی تھی نیند سی غم کو کہ موسم ناگہاں
بحر دیر میں کروٹیں لینے لگا، اب کیا کروں!
چرخ کی بے رنگیوں سے سست تھی رفتار غم
یک بیک ہر ذرہ گلشن بن گیا، اب کیا کروں

قفلِ بابِ شوق تھیں ماحول کی خاموشیاں
دفعتہً کافر پپیہا بول اٹھا، اب کیا کروں
ہجر کا سینے میں کچھ کم ہو چلا تھا پیچ و تاب
بال بکھرانے لگی کالی گھٹا، اب کیا کروں
آنکھ جھپکانے لگی تھی دل میں یادِ لحن یاد
مور کی آنے لگی بن سے صدا، اب کیا کروں
گھٹ چلا تھا غم کہ رنگیں بدلیوں کی آڑ سے
ان کا چہرہ سامنے آنے لگا، اب کیا کروں
آ رہی ہیں ابر سے ان کی صدائیں جوش جوش
اے خدا اب کیا کروں، یارِ خدا اب کیا کروں

طوفان کی آرزو

(۱۹۳۰ء)

پھر دل کو ہے جراحتِ پنہاں کی آرزو
یعنی کسی کی جنبشِ مژگاں کی آرزو

پھر چبھ رہے ہیں قلب میں غربت کے خار و خس
پھر ہے وطن کے سنبل و ریحاں کی آرزو

پھر ہے ہجومِ شامِ بلا، وحشت آفریں
پھر ہے طلوعِ صبحِ درخشاں کی آرزو

پھر روح شورِ زاغ و زغن سے ہے بیقرار
پھر دل کو ہے ترنمِ ہزاراں کی آرزو

پھر ہے ہوائے شہرِ ملامت کا اشتیاق
پھر ہے سوادِ کوچۂ جاناں کی آرزو

پھر قبلۂ عقل و ہوش سے پھر چکا ہے دل
پھر ہے جنونِ سلسلہ جنباں کی آرزو

پھر ہے طلسمِ عشوۂ ترکانہ کی تلاش
پھر ہے فریبِ وعدۂ جاناں کی آرزو

پھر نبضِ شوق میں ہے تپاں خونِ اضطراب
پھر جوئے سست رَو کو ہے طوفاں کی آرزو

پھر قلب میں ہیں پہلوئے جاناں کی حسرتیں
پھر دوش پر ہے زلفِ پریشاں کی آرزو

پھر لے رہی ہے شدتِ وحشت سے کروٹیں
پائے طلب میں کوہ و بیاباں کی آرزو

پھر تحفہ ہائے چاکِ جگر کو ہے آج کل
اک شوخ کے تبسمِ پنہاں کی آرزو

پھر شعلہ زن ہے عصرِ تغافل گزیدہ میں
ماضی کے التفاتِ فراواں کی آرزو

پھر سقف و بامِ گوشۂ خلوت پہ ہے محیط
بزمِ نشاط و سیرِ گلستاں کی آرزو

پھر مسندِ خیال پہ ہے گرمِ رستخیز
شمع و شراب و شعر و شبستاں کی آرزو

پھر جلوہ گر ہے منظرِ وہم و خیال پر
اک نو بہارِ فتنۂ دوراں کی آرزو

بیزار ہے سکوں کی راتوں سے جانِ زار
آنکھوں کو پھر ہے خوابِ پریشاں کی آرزو

بے گریہ، خال و خط پہ ہے رنگِ فسردگی
رُخ پر ہے آنسوؤں سے چراغاں کی آرزو

پھر کچھ دنوں سے دیدۂ گریانِ جوش ہیں
غلطاں ہے ان کے گوشۂ داماں کی آرزو

پھر اس طرف چلا ہوں

(۱۹۳۰ء)

پھر اس طرف چلا ہوں فسانہ لیے ہوئے
ماضی کا ہر نفس میں ترانہ لیے ہوئے

پھر جا رہا ہوں جانبِ معمورۂ طرب
ویرانِ دل میں غم کا خزانہ لیے ہوئے

پھر خود سے محو کر کے رواں ہوں سوئے نگار
پیرِ سفر کا دل میں بہانہ لیے ہوئے

پھر کوئے سرخوشی کی طرف بڑھ رہا ہوں میں
شعر و شراب و چنگ و چغانہ لیے ہوئے

پھر جا رہا ہوں ذہنِ خرد آرمیدہ میں
بھولا ہوا جنوں کا زمانہ لیے ہوئے

پھر بزمِ رنگ و بو کی طرف مڑ رہا ہوں
خونِ گذشتہ زندگی کا فسانہ لیے ہوئے

پھر گامزن ہوں میکدۂ دوش کی طرف
رفتار میں خمارِ شبانہ لیے ہوئے

کیا نازِ عشق ہے کہ ادھر جا رہا ہوں جوش
اس پر فقیر بھی طبعِ شہانہ لیے ہوئے

دریوزۂ بے مہری

(۱۹۳۰ء)

ماضی کی سمت ہنس کے اشارا نہ کیجیے
اب ذکرِ آب و رنگِ تمنا نہ کیجیے

مانوس ہو چکا ہوں غمِ روزگار سے
اب ساز و برگِ عیش مہیا نہ کیجیے

سینہ نالِ ذوقِ طرب سے ہے چاک چاک
اب فتنۂ نشاط کا در وا نہ کیجیے

سرمستیٔ شبانہ کا انجام، الاماں
اب اہتمامِ ساغر و مینا نہ کیجیے

دل کو لبھا چکی ہیں تغافل شعاریاں
تکلیفِ التفات گوارا نہ کیجیے

راس آ چکی ہے عشق کو بے چین زندگی
اب میرے اضطراب کی پروا نہ کیجیے

دل صلح کر چکا ہے زمانے کے بخل سے
اب مرحمت کی زحمتِ بیجا نہ کیجیے

تھے جس میں وہ شرار کہ اللہ کی پناہ
اب پھر اسی امید کو پیدا نہ کیجیے

اُف ری مزاجِ حسن کی باطل نوازیاں
اب عشقِ حق پسند کا چرچا نہ کیجیے

کیا فائدہ کہ جاگ اٹھے پھر سے آرزو
اب ذکرِ بے وفائیِ دنیا نہ کیجیے

ہر آن گوشِ روح میں چبھتی تھی جس کی دھار
وہ لوچ پھر زبان میں پیدا نہ کیجیے

زخمی تخیل جس کی باڑھ سے خواب کر دیئے
وہ تیغ اب نظر میں برہنا نہ کیجیے

اک عمر، اعتدال سے بھی لے چکا ہوں کام
اب شکوۂ مزاجِ تمنا نہ کیجیے

دل پر گزر چکی ہیں ہزاروں قیامتیں　　اب مسکرا کے وعدۂ فردا نہ کیجیے
سینے میں بے نقاب ہیں سابق کے تجربے　　اب پرسشِ خلوص کا دعویٰ نہ کیجیے
تجدید چاک کی نہیں دامن کو آرزو　　اب نقلِ اضطرابِ زلیخا نہ کیجیے
لیکن اگر حضور کو بدبخت جوش پر
آتا نہیں ہے رحم، تو اچھا نہ کیجیے

گواہ رہنا

(۱۹۳۰ء)

اے آم کے خوشنما درختو ؟
اس بات کے تم گواہ رہنا
اس اجڑے ہوئے مکاں کے آگے
تھمتا نہیں آنسوؤں کا بہنا

☆

دریوزۂ نظر

(۱۹۳۰ء)

خدا کے واسطے اے حاجبو نہ دیر کرو — حریم ناز میں کوئی پکار کر کہہ دو
کہ پھر کوئی وطن آوارہ و جگر افگار — ملول و بیکس و مجبور و غم کش و بیمار
جگر کو خون کئے ہچکیاں اٹھائے ہوئے — در حضور پہ حاضر ہے سر جھکائے ہوئے
دھڑکتا ہے کلیجہ ہر ایک آنسو میں — پکارتا ہے کہ دل اب نہیں ہے قابو میں
مرا رفیق نہیں ہے کوئی خدائی میں — زمیں جگہ نہیں دیتی تری جدائی میں
جبیں کے نقش ہیں رنگِ سجود دکھانے کو — ہوا ہوں دور سے حاضر سلام کرنے کو

نہ مرحمت، نہ محبت کا خواستگار ہوں میں
بس ایک نیم نظر کا امیدوار ہوں میں

انتہائی بے تعلقی

(۱۹۳۰ء)

روبرو اس کے گیا میں، اس قدر مدت کے بعد
اس کا کیا غم اس نے ادنیٰ سی عنایت بھی نہ کی

مجھکو تو صرف اس کا شکوہ ہے کہ اس نے مجھ سے جوش
اتنے دن تک دور رہنے کی شکایت بھی نہ کی

نقشِ خیالِ دل سے مٹایا نہیں ہنوز

(۱۹۳۰ء)

نقشِ خیالِ دل سے مٹایا نہیں ہنوز
بیدرد میں نے تجھکو بھلایا نہیں ہنوز

تیری ہی زلفِ ناز کا اب تک اسیر ہوں
یعنی کسی کے دام میں آیا نہیں ہنوز

یادش بخیر جس پہ کبھی تھی تری نظر
وہ دل کسی سے میں نے لگایا نہیں ہنوز

وہ سر جو تیری راہ گزر میں تھا سجدہ ریز
میں نے کسی قدم پہ جھکایا نہیں ہنوز

محرابِ جاں میں تو نے جلایا تھا خود جسے
سینے کا وہ چراغ بجھایا نہیں ہنوز

اس پیکِ خاص کو جسے ٹھکرا دیا ہے تو
اپنی نظر سے میں نے گرایا نہیں ہنوز

بیہوش ہو کے جلد تجھے ہوش آ گیا
میں بد نصیب ہوش میں آیا نہیں ہنوز

دنیا نے تجھکو خوابِ گراں سے جگا دیا
لیکن مجھے کسی نے جگایا نہیں ہنوز

تو کاروبارِ شوق میں تنہا نہیں رہا
میرا کسی نے ہاتھ بٹایا نہیں ہنوز

گردن کو آج بھی تری باہوں کی یاد ہے
یہ منتوں کا طوق بڑھایا نہیں ہنوز

مر کر بھی آئے گی یہ صدا قبرِ جوش سے
بیدرد میں نے تجھکو بھلایا نہیں ہنوز

ہنوز یاد ہے

(۱۹۳۱ء)

ہنوز یاد ہے وہ رنگِ اضطراب ترا
بھرا تھا درد کے نغموں سے جب رباب ترا

عجیب دور تھا وہ دور بھی جب اے ظالم
لباسِ عشق میں تھا حسنِ لاجواب ترا

جو شب کو روپ میں پروانے کے تھی شمع تری
سحر کو بھیس میں بلبل کے تھا گلاب ترا

وہ تیری پہلی ملاقات کی روپہلی رات
اُدھر تھا چاند، اِدھر دیدۂ پرآب ترا

کبھی خدا کی مشیت پہ برہمی تیری
کبھی خود اپنی تمناؤں پر عتاب ترا

وہ ماہتاب کے طوفان میں الجھنیں تیری
وہ ابر و باد کی ہلچل میں اضطراب ترا

وہ ابتدائے محبت کی تند راتوں میں
بساطِ غم پہ مچلتا ہوا شباب ترا

وہ آنسوؤں کے دھندلکے میں چشمِ ناز تری
وہ کروٹوں کے تلاطم میں فرشِ خواب ترا

وہ بات بات میں چھالیکا سا تپک اٹھنا
نظر جھکا کے وہ لہجہ دمِ خطاب ترا

وہ میری بزمِ محبت وہ تیری شمعِ جمال
وہ دامِ ذرۂ خاکی میں آفتاب ترا

وہ تیری زلف کے خم سے مری پریشانی
وہ اپنی سانس کی خوشبو سے پیچ و تاب ترا

وہ اضطراب کا روندا ہوا سکوں مرا
وہ ولولوں کا ستایا ہوا حجاب ترا

شرر کی طرح جھپکتا ہوا وہ میرا سوال
وہ دل کی طرح دھڑکتا ہوا جواب ترا

نہ پوچھ جوشؔ سے کس درجہ تلخ و تیز ہے یہ
اس التفات کے بعد اب یہ اجتناب ترا

یاد کرو وہ دن

(١٩٣٢ء)

یاد کرو وہ دن کہ ہم تھے رازدانِ یک دگر — رازدانِ یک دگر، شرح و بیانِ یک دگر
یاد کرو وہ دن کہ ہم تھے دورِ نوشا نوش میں — لحنِ شیریں و شرابِ ارغوانِ یک دگر
یاد کرو وہ دن کہ ہم تھے قربِ کامل کے طفیل — قالبِ یک دیگر و روحِ روانِ یک دگر
یاد کرو وہ دن کہ ہم تھے بزمِ فکر و بحث میں — ہم خیال و ہم نوا و ہم زبانِ یک دگر
یاد کرو وہ دن کہ ہم تھے عہدِ صلح و جنگ میں — مہربانِ یک دگر، نامہربانِ یک دگر
یاد کرو وہ دن کہ ہم تھے شام سے تا صبح گاہ — قصۂ یک دیگر و افسانہ خوانِ یک دگر
یاد کرو وہ دن کہ ہم تھے کاروبارِ شوق میں — دولتِ یک دیگر و جنسِ دکانِ یک دگر
یاد کرو وہ دن کہ ہم تھے آرزو کی راہ میں — کاروانِ شوق و گردِ کاروانِ یک دگر

یاد کرو وہ دن بہ مرگِ جوشؔ جب ناز و نیاز
دورِ سوز و ساز میں تھے ترجمانِ یک دگر

تمام شد